دسمبر 2006

ماہنامہ

# اردو دنیا

نئی دہلی

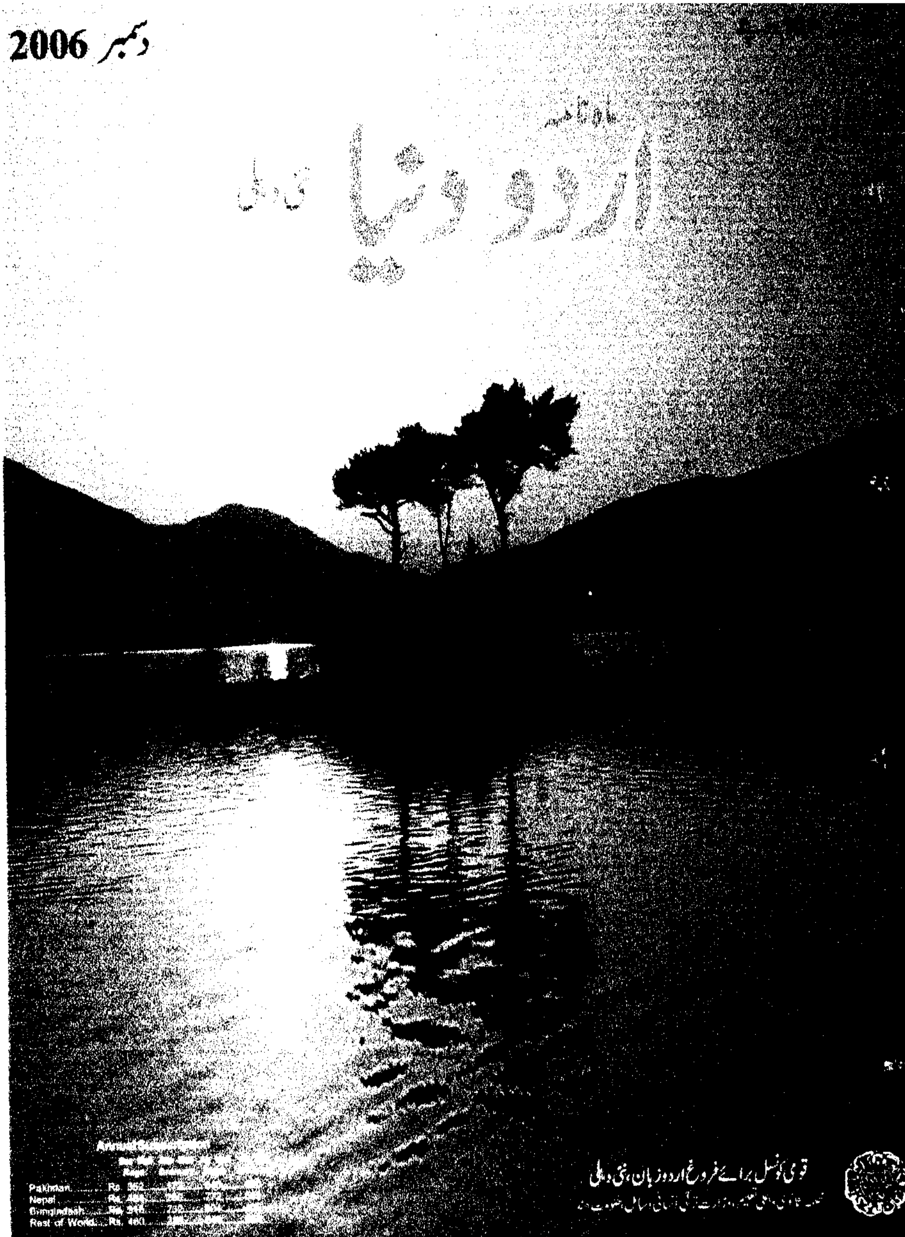


قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

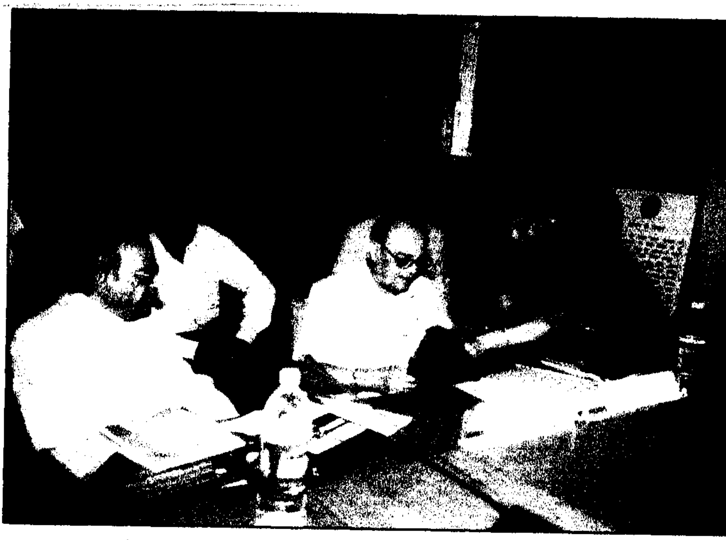

مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے چیئرمین جناب ارجن سنگھ نے کونسل کی تین اہم مطبوعات ''اے کورس ان اردو پروفیشن'' (مرتب: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ) ''کلیات سعادت حسن منٹو' جلد اوّل (مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی) اور'' کلیات علی سردار جعفری' جلد اوّل و دوم (مرتب: پروفیسر علی احمد فاطمی) کا اجرا 17 اکتوبر 2006 کو شاستری بھون میں منعقد ایگزیکٹیو بورڈ کی میٹنگ میں کیا۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں (دائیں سے) محترمہ دشمی چودھری (ڈائرکٹر قومی اردو کونسل) جناب ارجن سنگھ اور جناب شمس الرحمن فاروقی (وائس چیئرمین قومی اردو کونسل)۔

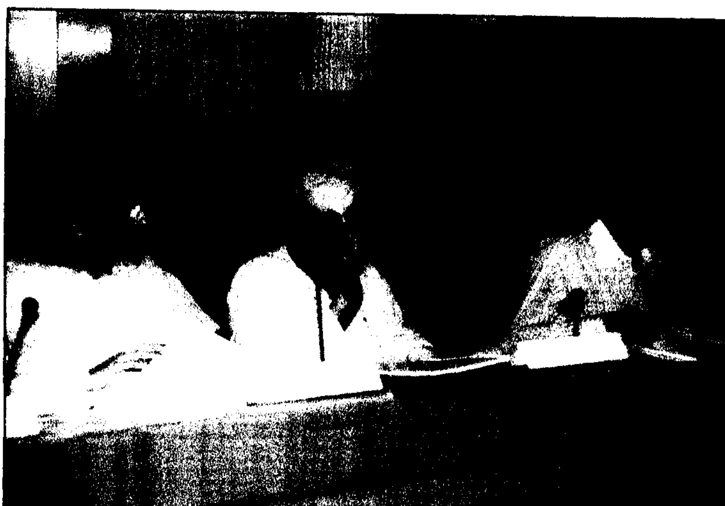

17 اکتوبر کو شاستری بھون میں کونسل کی 23 ویں ایگزیکٹیو بورڈ کی میٹنگ کے موقعے پر لی گئی تصویر میں (دائیں سے)
پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان (وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (حیدرآباد)، ڈاکٹر علی جاوید اور پروفیسر نسیم بھالیہ

ماہنامہ

# اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔8، شمارہ۔12 دسمبر 2006

مدیر: رشمی چودھری

معاون مدیر: ڈاکٹر فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: اسد نیاز، بہلول احمد
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپئے، سالانہ -/100 روپئے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103938، 26103381
فیکس: 26179657، 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: ncpuleditorial@yahoo.co.in
urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26169416، 26109746

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

## اس شمارے میں

آپ کی بات .......... 2

ہماری بات .......... 5

**روبرو**

● مجتبیٰ حسین سے گفتگو .......... فیروز عالم .......... 6

**زبان اور تعلیم**

● اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف .......... شمس الرحمٰن فاروقی .......... 11

● نصاب کی تیاری: چند رہبر اصول .......... سید صفی اللہ .......... 13

● ہندوستان میں ابتدائی تعلیم کی صورت حال .......... عبدالعلیم قدوائی .......... 16

**صحافت**

● قومی صحافت کا معمار اوّل — مولوی محمد باقر .......... جی۔ ڈی۔ چندن .......... 19

**سائنس**

● دیہی و زرعی کہاوتیں، سائنس کی کسوٹی پر .......... اقبال محی الدین .......... 25

**معاشیات**

● ہر شعبے میں روزگار کو فروغ دینے کی ضرورت .......... بھرت جھن جھن والا .......... 32

**ادب**

● اردو مشاعرے اور بیرونی سیاح .......... مجتبیٰ حسین .......... 34

**گوشۂ باقر مہدی**

● باقر مہدی سے چند آدھی ادھوری ملاقاتیں .......... سلام بن رزاق .......... 36

● باقر مہدی معاصرین کی نظر میں .......... ترتیب: فیروز عالم .......... 41

● میں اور میرا فن .......... باقر مہدی .......... 47

● چند نظمیں اور غزلیں .......... باقر مہدی .......... 49

**کیریئر گائیڈنس**

● طلبہ کے لیے عملی زندگی میں رہنمائی .......... سید محمد عمیر .......... 52

**ہماری مطبوعات سے**

● ''جامع التذکرہ'' سے اقتباس .......... مولف: محمد انصار اللہ .......... 54

اردو خبرنامہ .......... ادارہ .......... 60

تبصرہ و تعارف .......... کتابوں پر تبصرے .......... 68

**بچوں کا گوشہ**

● اوّلین غبارے (''سائنس کی کہانیاں'' سے ماخوذ) .......... سکنف اور سکنف .......... 75

● پیشہ ور رشوت خور .......... مہیندر ناتھ .......... 79

# آپ کی بات

■ **مسعود حسین خاں، جاوید منزل، جامعہ اردو روڈ، دودھ پور، علی گڑھ**

نومبر کا ''اردو دنیا'' ہمدست ہوا۔ روپ کرشن بھٹ صاحب کا مضمون ''ہندوستان میں اردو کی صورت حال'' پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ میری نظر سے اردو کے بارے میں اس سے جامع، متوازن اور معروضی نقطۂ نظر سے لکھا ہوا مضمون اب تک نہیں گزرا۔ میری ان سے ذاتی واقفیت بالکل نہیں۔ اصل مضمون انگریزی میں تھا یا ہندی میں؟ ترجمہ بہت اچھا اور معیاری ہے۔ کاش ہمارے دوست پروفیسر گیان چند اسے دیکھ سکتے اور اس سے سبق لے سکتے۔

ان کے اس مضمون میں جامعیت کے علاوہ اردو کے لیے غالب کی ترکیب میں ''دل گداختہ'' کی سوزش بھی پائی۔ اگر آپ اپنے گراں قدر رسالے میں اس قسم کے مضامین اور شائع کرسکیں تو کیا کہنا!

کچھ عرصہ ہوا جب علی رفاد فتیحی صاحب نے (جو اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں صدر شعبۂ لسانیات ہیں) اردو کے بارے میں اعداد و شمار کی مدد سے گراں قدر مضامین شائع کیے تھے، اس وقت بھی میں نے مبارکباد کا خط لکھا تھا لیکن جب آپ کے اپنے ادارے میں روپ کرشن بھٹ جیسے حضرات موجود ہیں تو آپ کے لیے اس قسم کے مضامین کی کیا کمی ہوسکتی ہے۔

میری جانب سے انھیں مبارکباد دیجیے اور یہ یقین دہانی بھی کہ ان کی ایسی عالمانہ تحریروں کو پڑھنے والے آج بھی موجود ہیں۔ یہ خط میں اپنے بسترِ علالت سے تحریر کر رہا ہوں، اگر اچھا ہوتا تو کچھ زیادہ لکھتا۔

■ **اسرار احمد اسرار، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی سرینگر**

اردو دنیا کا تازہ شمارہ ملا۔ سبھی مضامین پڑھے۔ جو پسند آئے ان میں ''اردو زبان اور روزگار کے مواقع''، ''ہماری قومی زبان''، ''برطانیہ میں اردو''، ''ہندوستان میں ریموٹ سنسنگ'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مضمون ''اردو زبان اور روزگار کے مواقع'' قابل فکر بھی ہے اور قابل عمل بھی۔ اس نوعیت کے مضامین ''اردو دنیا'' میں بار بار چھپنے چاہئیں تاکہ سوئے ہوئے لوگ بیدار ہوسکیں۔

مرحوم عبدالعلیم کے مضمون ''ہماری قومی زبان'' میں خوبیوں کے سوا کچھ کمیاں بھی نظر آئیں۔ مثلاً ان کا یہ لکھنا کہ ''ہندوستانی'' نام سب سے پہلے گل کرسٹ نے 1887 کے قریب استعمال کیا تھا، صحیح نہیں ہے۔ یہ جملہ پڑھ کر قارئین کو یہ تاثر ضرور ملا ہوگا کہ گل کرسٹ نے ہی سب سے پہلے 'ہندوستانی' نام ہندوستان کی مقبول عام زبان کا رکھا ہوگا۔ ایسی بات نہیں ہے بلکہ گریرسن کا لکھنا ہے:

"The earliest English writers in India called the language 'moors' and it appears to be Gilchrist, who about 1787 first coined the word 'Hindostani' or he spelt it 'Hindoostanee'."(i)

یعنی مختصراً انگریز قلمکاروں میں گل کرسٹ پہلے انگریز ہیں جنھوں نے لفظ ''ہندوستانی'' کا استعمال کیا۔ ورنہ گل کرسٹ یا انگریزوں سے پہلے یہ نام پرتگالی، فرانسیسی، لاطینی، جرمن وغیرہ مستشرقین اپنی قواعد و لغات میں استعمال کرچکے تھے۔ میں یہاں اختصار کے ساتھ چند ثبوت پیش کرتا ہوں تاکہ بات واضح ہوجائے:

1. شروع میں یول (Yule) کے بقول 1616 میں لفظ ''ہندوستانی'' زبان کے لیے استعمال ہوا (2)
2. ہندوستانی نام سے 1630 میں فارسی، ہندوستانی، انگریزی اور پرتگالی، لغت سورت سے شائع ہوئی۔ گیان چند جین نے 'لسانی مطالعے' میں لکھا ہے کہ یہ کتاب پرتگالی میں مرتب ہوئی ہوگی (3) سلیم اختر کے بقول اس کے مولف کا نام مسٹر کورج ہے (4)۔
3. 1704 میں فرانسیسی مستشرق فرانسکو ماریا دتور نے اپنی لغت، 1715 میں ہالینڈ کے جان جوشوا کیٹلر نے اپنی قواعد اور 1744 میں جرمن کے شلز نے اپنے گریمر میں 'ہندوستانی' نام استعمال کیا۔ بعد میں متعدد مستشرقین نے اپنی کتابوں میں اردو کے لیے 'ہندوستانی' کا نام استعمال کیا اور یوں گل کرسٹ تک پہنچتے پہنچتے یہ نام مستشرقین میں مقبول ہوچکا تھا۔

عبدالعلیم صاحب کے مضمون کے حوالے سے یہ بات بھی لکھ دینا چاہتا ہوں کہ ان سے مضمون میں صحیح سن لکھنے میں سہو ہوا ہے۔ یہی غلطی ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر علی جاوید کی کتابوں میں بھی ہے جس کی نشاندہی اور تصحیح از حد ضروری ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب ''اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ'' ص 31 پر اولیس احمد ادیب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''اردو زبان کے لیے سب سے پہلے 'ہندوستانی' لفظ گل کرسٹ نے 1887 میں استعمال کیا''۔ حالانکہ سلیم اختر خود یہ مانتے ہیں کہ لفظ 'ہندوستانی' کا استعمال گل کرسٹ سے پہلے ہی ہوا تھا لیکن وہ غلط سن کی تصحیح نہ کرسکے۔

ڈاکٹر علی جاوید اپنی کتاب ''برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو'' ص: 122 پر لکھتے ہیں ''شاید گل کرسٹ پہلا شخص ہے جس نے 1986-87 میں لفظ 'ہندوستانی' کا استعمال کیا۔''

ڈاکٹر علی جاوید نے یہاں وہی بات لکھی جو عبدالعلیم صاحب نے کہی تاہم شک کی گنجائش رکھی۔ لیکن ان کے یہاں سن میں 100 سال کا اضافہ اور ہوا۔

بہر حال حق بات تو یہ ہے کہ گل کرسٹ کی 9 جنوری 1841 کو پیرس میں 82 سال کی عمر میں وفات ہوئی گویا 1887 میں انھیں وفات پائے ہوئے 46 چھیالیس سال ہو چکے تھے۔

### ماخذات


1. Linguistic survey of India By: Grierson: Vol.IX part-I Page.no.43
2. Linguistic Survey of Inida By: Grierson: Vol.IX part-I Page.no.3
3. لسانی مطالعے از گیان چند جین۔ ص:122
4. 'اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ' از سلیم اختر۔ ص:163


■ **ڈاکٹر شمس بدایونی، 58 نیو آزاد پورم کالونی، بریلی**

اردو دنیا کا تازہ شمارہ ملا۔ ''اردو روزمرہ'' کے عنوان سے آپ نے جو نیا کالم شروع کیا ہے وہ جہاں معلومات افزا ہے وہیں بروقت بھی ہے۔ یونیورسٹی سطح پر اردو کی تعلیم زبان و بیان کی باریکیوں کی طرف ملتفت نہیں کر پاتی۔ اس کالم سے نئے اردو داں حضرات کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

آپ نے اس کالم کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا انتخاب کیا ہے، یہ بھی اپنے آپ میں قابل ذکر بات ہے۔ ''لغات روزمرہ'' کے نام سے ان کی کتاب نے اہل علم و قلم کو بڑی ٹھوس معلومات اور ہدایات دی تھیں۔ میں نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے اس کتاب کی جلد دوم پیش کرنے کی فاروقی صاحب سے گذارش کی تھی۔ آپ کے اس کالم سے شاید دوسری جلد کا آغاز ہو رہا ہے۔ میری طرف سے آپ کو اور فاروقی صاحب کو اس مفید مطلب کالم کے لیے مبارکباد۔

■ **بہلول احمد، مہدیوا، جوکی ہاٹ، ضلع ارریہ، بہار۔ 854329**

''اردو دنیا'' نومبر 2006 کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ ہمیشہ کی طرح یہ شمارہ بھی قابل ستائش ہے۔ اردو رسائل و جرائد میں شاید ہی اس نوعیت کا کوئی رسالہ ہو جو اس کی ہمسری کر سکے۔ ''زبان اور تعلیم'' کے عنوان سے جو نیا کالم آپ نے شروع کیا ہے، یہ ایک اچھا قدم ہے۔ خاص طور پر ان اردو داں حضرات کے لیے یہ کالم بے حد مفید ہے جو اردو زبان و قواعد سے بہ خوبی واقف نہیں ہیں۔ اس سے ان طلبہ اور طالبات کو فائدہ حاصل ہوگا جو کہ جدید اردو، روزمرہ، محاورہ، صرف، زبان و قواعد سے بے بہرہ ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ شمارے میں ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ کا مضمون ''ہندوستان میں اردو کی صورت حال'' بے حد معلوماتی ہے۔ جناب اظہار اثر کا سائنسی مضمون ''کشش ثقل کیا ہے'' بھی بہت عمدہ ہے۔ علاوہ ازیں دیگر تمام مشمولات ''جواہر لال نہرو اور بچے''، ''جانوروں کی سرکار''، ''تبصرہ و تعارف''، ''اردو خبرنامہ''، ''عیدگاہ''، ''دوائی''، ''شاہ کی رکھیل''، ''میرے عزیز دوست''، ''مولانا ابوالکلام آزاد کی عصری معنویت''، ''مولانا آزاد لسان الصدق اور فروغ اردو''، ''قابل تجدید کاری توانائی کے وسائل''، ''ان پیج، اردو پبلشنگ کی بنیادی ضرورت''، ''بہار قانون سازیہ میں اردو کی حیثیت''، ''تعلیم کا مقصد''، ''بچوں کی تربیت میں اساتذہ کا کردار'' اور ''ہماری بات'' وغیرہ بہترین پیش کش ہیں۔ ''اردو دنیا'' کے تازہ شمارے کا سرورق دیگر شماروں سے بالکل جدا ہے۔ دو تہواروں کا دو عدد خوبصورت فوٹو لگا کر رسالے کو ایک نیا رخ دیا گیا ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ کثرت میں وحدت کے ہندوستانی تصور کی بہترین عکاسی کی گئی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ بھی حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں۔

■ **ڈاکٹر مقبول احمد مقبول، شعبۂ اردو، اودے گیری کالج، ضلع لاتور، مہاراشٹر**

اکتوبر کا ''اردو دنیا'' نظر نواز ہوا۔ اردو دنیا کا ہر شمارہ لائق تحسین ہوتا ہے۔ تمام اردو رسائل میں ''اردو دنیا'' ہی کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ یہ ادب کے ساتھ ساتھ تعلیم و تدریس، سائنس اور طب، سماجیات اور معاشیات اور سائنسی دنیا میں ہونے والی نئی نئی تحقیقات و ایجادات سے اردو داں طبقے کو بیش قیمت معلومات فراہم کرتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں ''نینوٹیکنالوجی'' پر مضمون اردو داں طبقے کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ''قدیم مخطوطات و مطبوعات کا تحفظ'' بھی کارآمد اور مفید مضمون ہے۔ عبدالباری مسعود کے مضمون ''برطانیہ میں اردو'' سے اندازہ ہوا کہ برطانیہ میں اردو زبان مستحکم ہوتی جا رہی ہے۔ گوشۂ خورشید الاسلام کے ذریعے کم سے کم مجھے پہلی مرتبہ موصوف کے کلام کے مطالعے کا شرف حاصل ہوا۔

''اردو دنیا'' کے تحقیقی، تنقیدی، تاریخی اور علمی مضامین بے حد معیاری اور لاجواب ہوتے ہیں۔ ہر شمارہ خوب سے خوب تر کی کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ ستمبر کے شمارے میں شامل ''گوشۂ احمد ندیم قاسمی'' سے مرحوم کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی علمی، ادبی، شعری و تحقیقی خدمات کا اجمالی ہی سہی مگر جامع خاکہ سامنے آتا ہے۔ آپ نے مایۂ ناز قلم کاروں کے بہترین مضامین پیش کیے ہیں۔ تمام مضامین عمدہ ہیں۔ شخصیات کے کالم میں دانش غنی کا مضمون ''ایس آر رنگا ناتھن'' سے میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ اس شمارے میں شامل جینے گوڈ بولے کے انٹرویو سے موصوف کی شخصیت سے آگاہی ہوئی۔

■ **بھگوان داس اعجاز، ٹی۔ 451، بلجیت نگر، نئی دہلی۔ 110008**

''اردو دنیا'' کے اکتوبر 2006 کے سرورق پر استاد بسم اللہ خاں کی شہنائی بجاتے ہوئے ایک پرکشش تصویر دی گئی ہے۔ بسم اللہ خاں کی شہنائی کا سفر 1947 میں لال قلعے سے شروع ہوا تھا۔ ''آپ نے دنیا کے کونے کونے میں شہنائی کی گونج کو پہنچایا۔ اس کے لیے پورا دیش آپ کو نمن کرتا ہے۔ میں آپ کی عظیم خدمات کے لیے ایک حقیر تحفہ نذر کر رہا ہوں۔'' وزیر اعظم من موہن سنگھ کا یہ

خط پڑھ کر استاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بھرائی آواز میں بولے" انڈیا گیٹ پر اور دربھنگہ میں شہنائی بجانے کی تمنا کوئی پوری کرادے۔" استاد نے مزید کہا کہ اس مالی امداد کے لیے میں پردھان منتری کا شکر گزار ہوں۔ ان کے بیٹوں نے ان کی یاد میں انڈیا گیٹ پر شہنائی بجانے کی ان کی خواہش سرکار تک پہنچائی ہے۔

■ **سید مالک اشتر نقوی بمعرفت مولانا حیدر عباس، ملوکانواں۔ جے پی نگر۔ یو. پی.**

ایک ایسے دور میں جب تمام اردو رسائل و جرائد اپنی شناخت کھوتے جا رہے ہیں "اردو دنیا" کے مضامین اور مشمولات کا اعلیٰ معیار آپ کی کامیابی کا عکاس ہے۔ اکتوبر کا شمارہ میرے پیش نظر ہے۔ ساحرِ شہنائی بسم اللہ خاں اور خورشید الاسلام پر گوشہ خوب ہے۔ کیریر گائڈینس کالم کی مدد سے نوجوان طلبہ کی اچھی رہنمائی ہو رہی ہے۔ "خبرنامہ" اردو دنیا کی تمام سرگرمیوں کا احاطہ کر رہا ہے۔ مطبوعات کونسل کے اقتباس شائع کرنے کا فیصلہ بھی بے حد عمدہ اور مفید ہے۔ تزک جہانگیری سے اخذ حکایت بہت اچھی لگی۔ گوشۂ اطفال بھی خوب ہے۔

■ **انوار انصاری، اولڈ ہزاری باغ روڈ، چونا بھٹہ، شانتی نگر، رانچی۔ 834001**

ماہنامہ" اردو دنیا" اکتوبر 2006 کے سرورق پر شہنائی کے شہنشاہ استاد بسم اللہ خاں کی تصویر شائع کر کے آپ نے خاموشی سے ایک بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ سید امتیاز الدین کا مضمون بھی "شہنائی خاموش ہو گئی" گراں قدر ہے۔ آپ نے خورشید الاسلام کے سلسلے میں بھی مختصر مگر معیاری معلومات سے پُر گوشہ شائع کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے ان پر عمدہ تاثراتی مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔ عبدالباری مسعود کا" برطانیہ میں اردو کی صورتِ حال" ایک اچھا جائزہ ہے۔ اسی طرح دوسرے ممالک میں اردو کی صورتِ حال کا جائزہ بھی پیش کیا جاتا تو اردو کی صورتِ حال سے قاری کو خاطر خواہ آگاہی ہوتی۔ "ہمارے رہنما" سے ماخوذ رفیع احمد قدوائی کی سوانح عمری پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ یہی حال تزک جہانگیری سے ماخوذ" حکایت بادشاہ و باغبان" کو پڑھ کر ہوا۔ "اردو دنیا" میں اتنے اچھے اور عمدہ مضامین شائع کرنے کے لیے مبارکباد قبول کریں۔

■ **مقیم الدین، مونس بک ڈپو، قلعہ روڈ، خسرو نگر، علی گڑھ۔ 202002**

ماہنامہ" اردو دنیا" کا اکتوبر 2006 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس شمارے میں "اردو زبان اور روزگار کے مواقع" از حبیب الرحمٰن چغانی معلوماتی ہے۔ اس میں اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے کے ساتھ اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اقبال محی الدین کا مضمون" ہندوستان میں ریموٹ سنسنگ" بھی بہت عمدہ ہے۔ اس قسم کے مضامین کی اردو میں بہت ضرورت ہے جس سے اردو جاننے والوں کو جدید ترقی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بہت اچھا ہے۔

■ **بکل اتساہی۔ "صفرا روڈ" بلرامپور، (یو. پی.) 271201**

"اردو دنیا" شمارہ نومبر نظر نواز ہوا۔ "اردو دنیا" ایک معلوماتی دستاویز ہے۔ اس میں اردو زبان و ادب، تعلیم و تربیت، سائنس، معاشیات پر بھرپور مضامین ہوتے ہیں اردو داں طبقے کو مالا مال کرنے کی آپ کی کاوشیں خوب ہیں۔ ادھر جب سے برادرم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب وائس چیئرمین ہوئے ہیں رسالے کا چہرہ تابناک ہوا ہے۔ ان کے اصلاحی رویے پر عمل کیا جائے تو اردو زبان کے صحیح استعمال کا قرینہ آ ہی جائے گا۔ کبھی کبھی اکھرتا ہے کہ اردو دنیا صرف نثری رویے کا حامل ہے شعری ادب کی شمولیت کم ہی رہتی ہے۔ کبھی کبھی شعر و شاعری کو بھی اجاگر ہونا چاہیے۔

■ **لطیف حسین ادیب، 73 پھول والان، بریلی۔ 243003**

اردو دنیا شمارہ نومبر 2006 میں "اچھی اردو روز مرہ، محاورہ اور صرف" پڑھنے کا موقع ملا۔ از راہ کرم آپ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ اس وقت ایسے مضامین کی سخت ضرورت ہے۔ لوگ استفادہ کریں گے۔

■ **جلیل عشرت، آر. بی. منزل، جہانگیری محلہ، آسنسول، مغربی بنگال**

فکر ساز، دلکش اور پرکشش ماہنامہ" اردو دنیا" اپنے طرز کا انوکھا رسالہ ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ بیشک قابلِ مطالعہ اور معلوماتی مضامین کا انتخاب آپ کی دیدہ ریزی اور علم کا مظہر ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ درخشاں ستارہ اسی آب و تاب کے ساتھ ادبی افق پر چمکتا رہے اور اپنی ادبی و علمی شناخت برقرار رکھے۔

■ **محمد ناظم علی، نظام آباد، 80-1-6 ایل بی ایس نگر**

اردو رسائل میں" اردو دنیا" کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنے قاری کو جدید اور عصری علوم و فنون سے آگاہ کرتا ہے۔ عالم گیریت کے اس ماحول میں اردو کے لیے ایسے ہی رسالے کی ضرورت تھی۔ نومبر 2006 کا تازہ شمارہ یکم نومبر کو بدست ہوا۔ رشید امجد سے گفتگو معلوماتی ہے اور ادبی بصیرت کی حامل ہے۔ "زبان اور تعلیم" کے تحت "اچھی اردو، روز مرہ، محاورہ اور صرف" بھی زبان و قواعد اور لسانیاتی شعور عطا کرتا ہے۔ زبان و ادب کے قاری کے لیے ایسا کالم افادیت بخش ثابت ہوگا۔ روپ کرشن بھٹ نے" ہندوستان میں اردو کی صورت حال" میں اردو کی لسانی تاریخ اور تاریخی حیثیت سے اس کے ارتقا کے علاوہ عہد بہ عہد اس کے موقف کا جائزہ لیا ہے۔ یہ کافی معلومات افزا مضمون ہے۔ "تعلیم کا مقصد" میں مضمون نگار نے تعلیم کے روایتی کردار اور اس کی اخلاقی قدروں کو آشکار کیا۔ تعلیم کا عمدہ وصف کردار سازی اور شخصیت سازی ہے لیکن عصر حاضر میں تعلیم حصول معاش کا ذریعہ سمجھی جانے لگی ہے اور تجارت بن گئی ہے۔ "کشش ثقل کیا ہے" اظہار اثر کا سائنسی مضمون معلومات سے پر ہے۔ وہاب قیصر نے اپنے مضمون میں لسان الصدق کے حوالے سے اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ مشتاق احمد نے اپنے مضمون میں مولانا آزاد کی سیاسی، ادبی اور تعلیمی خدمات کو موضوع بنایا ہے اور ان کے افکار و نظریات کی عصری معنویت پر روشنی ڈالی ہے۔

□□□

# ہماری بات

نجی اسکولوں میں نرسری اور پہلی جماعت میں داخلے کے لیے انٹرویو کے نام پر جو کارگزاری اکثر اسکولوں میں جاری تھی، اس پر دہلی ہائی کورٹ میں ڈھائی سال قبل ایک رٹ دائر ہوئی تھی۔ نتیجے کے طور پر گذشتہ برس عدالت نے انٹرویو پر پابندی عائد کر دی تھی، اور نجی اسکولوں کو اس کا متبادل تلاش کرنے کی ہدایت دی تھی۔ نجی اسکولوں نے انٹرویو کا یہ متبادل تلاش کیا کہ بچوں اور ان کے والدین سے غیر رسمی ملاقات کی جائے گی اور اس ملاقات میں بچے کی صلاحیت اور والدین کی تعلیمی اہلیت معلوم کی جائے گی۔ لیکن عدالت نے یہ تجویز یہ کہہ کر مسترد کر دی تھی کہ یہ انٹرویو کی دوسری شکل ہے جس کو تعامل (انٹرایکشن) کہہ دیا گیا ہے۔

عدالت نے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے سینٹرل بورڈ آف سینڈری اسکول ایجوکیشن کے چیئرمین جناب اشوک گانگولی کی صدارت میں ایک پانچ رکنی کمیٹی تشکیل دی، جسے اپنی رپورٹ پیش کرنے کے لیے ڈیڑھ ماہ کا وقت دیا گیا۔ اس کمیٹی نے گذشتہ 18 اکتوبر کو عدالت میں اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے۔ اشوک گانگولی کمیٹی کی سفارشات کو قبول کرتے ہوئے عدالت نے فیصلہ صادر کیا ہے کہ ابتدائی جماعتوں میں داخلے کے لیے کسی بھی طرح کا امتحان یا انٹرویو نہیں لیا جاسکتا۔ داخلے کے لیے 100 نقاط (پوائنٹ) کا پیمانہ بنایا گیا ہے۔ اس پیمانے کی رو سے داخلے کی اہلیت کے لیے نقاط متعین کرنے میں بچوں کے گھر سے اسکول کے فاصلے کا بھی خیال رکھا جائے گا۔ اسکول سے تین کیلومیٹر کے فاصلے پر رہنے والے بچے کو بیس نقاط اور تین سے دس کیلومیٹر کی دوری پر رہنے والے بچوں کو آٹھ سے سولہ نقاط ملیں گے۔ بچے کا کوئی بھائی یا بہن اس اسکول میں پہلے سے زیر تعلیم ہے تو اسے بیس ترجیحی نقاط ملیں گے۔ لڑکی کے لیے مزید پانچ نقاط اور معذور کے لیے مزید پانچ نقاط مختص کیے گئے ہیں۔ اسکول میں کسی درخواست گزار بچے کے والدین نے بھی تعلیم حاصل کی ہے تو اسے مزید دس نقاط اور اگر والدین میں سے کوئی ایک وہاں کا طالب علم رہا ہے تو اسے پانچ نقاط ملیں گے۔ والدین کی تعلیم کے لحاظ سے بیس نقاط ہوں گے۔ بیس نقاط اسکول کے اختیار میں ہوں گے۔

اس طریقۂ کار پر تجربے کے طور پر اگلے تعلیمی سال (2007-08) سے عمل کیا جائے گا۔ فارم حاصل کرنے اور اسے پر کر کے داخل کرنے کے لیے یکم دسمبر 2006 سے 20 دسمبر 2006 تک کا عرصہ متعین کیا گیا ہے۔ 21 دسمبر سے 25 دسمبر تک کے درمیان داخلہ فارموں کی جانچ کی جائے گی۔ 31 جنوری 2007 کو منتخب بچوں کی فہرست، فہرست انقطاع (کٹ آف لسٹ) اور فہرست انتظار (ویٹنگ لسٹ) نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دی جائے گی۔ فیس جمع کرنے کے لیے یکم فروری سے 20 فروری تک کا وقت دیا گیا ہے۔ 26 فروری کو دوسری فہرست انقطاع نکالی جائے گی۔ 29 فروری تک داخلہ فارم واپس لیا جاسکتا ہے اور یکم اپریل 2007 سے باقاعدہ تدریس شروع کر دی جائے گی۔

جن اسکولوں کے نتائج ہمیشہ اچھے رہتے ہیں یا جن کی شہرت زیادہ ہوتی ہے، ان میں داخلے کے لیے عام طور پر زیادہ بھیڑ ہوتی ہے۔ غرض مند والدین سفارشیں کرانے اور عطیہ (ڈونیشن) تک دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ہر اسکول بہتر سے بہتر نتیجہ لانے کی کوشش میں رہتا ہے اس لیے وہ ان بچوں کو داخلے میں اولیت دینے کا آرزومند ہوتا ہے جن کے ماں باپ اچھی انگریزی بولتے ہوں، اپنے بچوں کے لیے غیر درسی تربیت (ٹیوشن) اور دیگر مصارف پر خاطر خواہ رقم خرچ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور ضرورت پڑنے پر مزید کسی نہ کسی طور سے اسکول کی معاونت کر سکتے ہوں۔ علاوہ ازیں اگر والدین صاحب حیثیت ہوں گے تو بچوں کی اسکولی وردی، کتابوں، بس اور دیگر مدوں (مثلاً تعلیمی یا تفریحی سفر) کے لیے زیادہ رقم خرچ کر سکیں گے۔ ان وجوہ کی بنا پر وہ نجی اسکول جو بہتر سمجھے جاتے ہیں، ان میں اثر و رسوخ والے اور معاشی اعتبار سے مستحکم لوگوں ہی کے بچوں کو داخلہ مل پاتا ہے اور ایسے لوگ عموماً ان باتوں پر دھیان نہیں دیتے کہ اسکول کی آمدنی اور خرچ کا تناسب کیا ہے، اور یہ کہ انھوں نے جو بھاری رقمیں بطور فیس وغیرہ جمع کی ہیں ان کو کس مصرف میں لایا جا رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں اسکولوں کو بڑی حد تک من مانی کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور بہت سے ذہین لیکن کم مستطیع بچوں کو داخلے سے محروم رہنا پڑتا ہے۔ اگر تمام اسکولوں میں شفافیت برتی جاتی اور داخلوں کے لیے مناسب جمہوری طریقۂ کار اپنایا جاتا تو شاید عدالت کو اس باب میں مداخلت نہ کرنی پڑتی۔

عدالت کے فیصلے اور گانگولی کمیٹی کی سفارشات کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم یہ بھی کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اب عوام کی بھی ذمہ داری ہے کہ تمام نجی اسکولوں پر نگاہ رکھیں کہ عدالتی فیصلے اور گانگولی کمیٹی کی سفارشات پر صحیح طور سے عمل درآمد ہو رہا ہے کہ نہیں۔

□□□

فیروز عالم

# مجتبیٰ حسین سے گفتگو

جناب مجتبیٰ حسین کا شمار عصرحاضر کے صف اول کے طنزومزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ 15 جولائی 1936 کو ضلع گلبرگہ (کرناٹک) میں پیدا ہوئے۔1956 میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے بی۔اے۔ کیا۔ پھر روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد دکن سے وابستہ ہوئے۔ 1962 میں اسی اخبار میں مزاحیہ کالم نگاری شروع کی۔ 1972 میں حیدرآباد سے دہلی منتقل ہوئے اور نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ سے وابستہ ہوئے جہاں سے 1991 میں بحیثیت ایڈیٹر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ آپ جاپان، برطانیہ، فرانس، امریکہ، کینیڈا، روس، ازبیکستان، پاکستان، سعودی عرب، سلطنت عمان اور متحدہ عرب امارات کی سیاحت کر چکے ہیں۔تکلف برطرف (1968)، قطع کلام (1969) قصّہ مختصر (1972)، بہر حال (1974)، آدمی نامہ (1981)، بالآخر (1982)، جاپان چلو جاپان چلو (1983)، الغرض (1987)، سوہے وہ بھی آدمی (1987)، چہرہ در چہرہ (1993) سفرِ لخت لخت (1995)، آخرکار (1997)،ہوئے ہم دوست جس کے (1999)، میرا کالم (1999)۔مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (دو جلدوں میں، (2002) مجتبیٰ حسین کے سفرنامے، مرتبہ:حسن چشتی (2003) مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم، مرتبہ: حسن چشتی (2004) آپ کی تعریف مرتبہ: سید امتیاز الدین (2005) آپ کی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے ''ضبط شدہ نظمیں'' اور ماہنامہ''آج کل'' کا ''اردو طنزومزاح نمبر'' بھی مرتب کیا۔ہندی میں بھی آپ کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ہندوستان کی کئی علاقائی زبانوں میں آپ کی تحریروں کے تراجم ہوئے ہیں۔ آپ کا سفرنامہ جاپان چلو، جاپانی زبان میں بھی شائع ہوا۔ آپ کو اڑیا ادیبوں کی تنظیم سرس ساہتیہ سمیتی، کٹک کی، جانب سے ''ہاسیہ رتن'' کا خطاب۔(1980)، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کا پہلا غالب ایوارڈ، برائے اردو طنزومزاح۔(1984)، ایوارڈ برائے تخلیقی نثر اردو اکادمی دہلی۔(1990)، کل ہند مخدوم محی الدین ادبی ایوارڈ، آندھرا پردیش اردو اکادمی، (1993)، کل ہند کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ برائے، اردو طنزومزاح ہریانہ اردو اکادمی۔(1999) کل ہند ایوارڈ برائے مجموعی خدمات، کرناٹک اردو اکیڈمی(2002)، کل ہند جوہر قریشی ایوارڈ برائے طنزومزاح، مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی (2002) مل چکا ہے۔علاوہ ازیں تمام تصانیف پر ملک کی مختلف اکادمیوں کے انعامات مل چکے ہیں۔ جناب مجتبیٰ حسین سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات قارئین ''اردو دنیا'' کی نذر ہیں۔

سوال: آپ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتایئے۔آپ کے گھر کا ماحول کیسا تھا،آپ کے بچپن کے دن کیسے گزرے؟

جواب: میں ریاست حیدرآباد کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوا۔ والد تحصیلدار تھے۔میرے دادا نے غربت کی زندگی گزاری۔ والد محمد احمد حسین اور تایا محمد اسحٰق بچپن میں ہی حیدرآباد چلے گئے۔تایا وکیل بن گئے۔ میرا آبائی وطن عثمان آباد ہے جو اب مہاراشٹر میں ہے۔ والد گلبرگہ میں تحصیلدار تھے۔ چنچولی (ننھیال) میں 15 جولائی 1936 کو میری پیدائش ہوئی۔سرٹیفکیٹ میں میری عمر 3 سال بڑھا کر لکھی گئی کیوں کہ اس زمانے میں 16 سال سے کم عمر میں میٹرک کے امتحان میں شامل ہونے پر پابندی تھی۔ میں نے گلبرگہ میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ عثمان آباد میں، جہاں والد واپس آ گئے تھے، گزارا۔ چھٹیوں میں ارلا اور راجوری چلا جاتا تھا۔ پولیس ایکشن تک میرا خاندان خوشحال تھا۔گلبرگہ، اورنگ آباد اور ورنگل تین صوبے داریاں تھیں۔ یہ تین لسانی علاقوں کے حساب سے تھیں۔ گلبرگہ کے صوبیدار امیر علی خاں نہایت ادب دوست تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ گلبرگہ میں سیشن جج تھے۔ ان کے رشتے کے بھائی حسین احمد بیگ محکمۂ مال میں تھے۔ان کی وجہ سے وہاں 1925 اور 1930 کے بعد ادب کا ماحول بنا۔ ہمارے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کی ہمت افزائی مرزا فرحت اللہ بیگ نے کی۔ وہاں میرے بھائی نے پہلی ادبی انجمن بنائی۔ بعد میں ابراہیم جلیس بھی

اس ماحول سے متاثر ہوئے۔ ہمارے گھر میں ادب کا ماحول شروع سے رہا۔ بڑے بھائی گریجویشن کر چکے تھے۔ میں ساتویں آٹھویں درجے میں تھا جب پولیس ایکشن ہوا اور سب سے زیادہ تباہی عثمان آباد میں ہوئی یہاں تک کہ بچپولی میں میرے ماموں کا قتل میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میں نے زندگی کے تضادات اور نشیب و فراز کو بڑی کم عمری میں دیکھا۔ میں اس زمانے میں گھنٹوں اکیلا ہو جاتا تھا اور قبرستانوں میں جا کر بیٹھنے کی عادت ہوگئی تھی۔ میں رنجیدہ بہت رہتا تھا۔ اس افراتفری کے ماحول میں تعلیم ہو رہی تھی۔ اسی صورت حال میں میں نے میٹرک کا امتحان دیا۔ اس کے بعد میں نے زندگی کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ خوف سے نکلنے کے لیے میں سماجی کاموں اور ثقافتی پراگراموں میں بہت حصہ لیتا تھا۔ ڈراموں میں اچھی اداکاری پر مجھے انعامات بھی ملے۔ میں گلوکار بھی تھا۔

سوال: ادب کی طرف کیسے راغب ہوئے؟

جواب: بھائیوں کی وجہ سے بچپن سے ہی مطالعے کی عادت ہوگئی۔ خصوصاً روسی ادب ترجمے کے حوالے سے کم عمری میں ہی پڑھا۔ تنہائی میں ادب ہی میرا ساتھی تھا۔ تانڈور ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے گلبرگہ کے انٹرمیڈیٹ کالج سے انٹر کیا۔ یہاں تک آتے آتے خوف اور دہشت سے نکل آیا تھا۔ گلبرگہ میں طلبہ یونین کی بزم اردو کا جنرل سکریٹری بنا۔ میں نے اس زمانے میں وہاں کی تاریخ کا سب سے بڑا کل ہند مشاعرہ کرایا تھا جس میں ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی بھی آئے تھے۔ جگن ناتھ آزاد نے اس کی صدارت کی تھی۔ اسی زمانے میں لکھنے کا شوق میرے استاد مولوی عبدالمنان کی وجہ سے ہوا۔ اقبال کے مصرعے:

''اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے''

پر ان کے کہنے پر ایک انشائیہ لکھا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور حوصلہ افزائی کی۔

1953 میں عثمانیہ یونیورسٹی آگیا۔ وہ حیدرآبادی تہذیب کے ساتھ ساتھ اردو تہذیب کے بھی عروج کا عہد تھا۔ مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، بدر شکیب، میر حسن وغیرہ اہم ادبی شخصیات کے علاوہ میرے بھائی محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس بھی ادبی افق پر چھائے ہوئے تھے۔

1952 کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو میڈیم ختم کر دیا گیا۔ میں نے اردو ایک مضمون کے طور پر پڑھی۔ سیاسیات Main مضمون تھا۔ میں وہاں بھی بزم اردو کا جنرل سکریٹری بنا۔

سوال: روزنامہ ''سیاست'' سے کیسے وابستگی ہوئی؟

جواب: 1949 میں محبوب حسین جگر صاحب اور عابد علی خاں صاحب نے مل کر ''سیاست'' نکالا۔ 1997 میں جگر صاحب کا انتقال ہوا۔ میں کالج کے زمانے سے ہی اخبار میں کچھ نہ کچھ کام کر دیتا تھا۔ تبصرہ وغیرہ لکھ دیتا۔ بی۔اے۔ کرنے کے بعد باقاعدہ ''سیاست'' جوائن کیا۔ میرے ساتھیوں میں وحید اختر اور اساتذہ میں علی محمد خسرو، عبدالقادر سروری، حمید الدین شاہد، حفیظ قتیل تھے۔ بھائیوں کے ساتھ میں بھی ترقی پسند تحریک سے قریب تھا۔ ایک عرصے تک صحافی کی حیثیت سے کام کیا۔ ''سیاست'' کا ایک طنزیہ کالم ''شیشہ و تیشہ'' شاہد صدیقی (شاعر اور نثر نگار) لکھا کرتے تھے۔ 31 جولائی 1962 کو ان کا انتقال ہوگیا۔ کئی لوگوں سے یہ کالم لکھوایا گیا لیکن بات نہیں بن پائی۔ جگر صاحب نے اچانک مجھ سے کہا کہ تم لکھو، میں نے بادل ناخواستہ وہ کالم لکھا۔ اس طرح 12 اگست 1962 کو صبح دس بجے میں نے کالم نگاری شروع کی۔

سوال: آپ کے ابتدائی کالموں پر قارئین کا ردعمل کیسا رہا؟

جواب: ابتدا میں کوہ پیما کے فرضی نام سے کالم لکھے۔ شاہد صاحب کوہ کن کے نام سے لکھتے تھے۔ پانچ چھ دن کے بعد لوگ پوچھنے لگے کہ کون یہ کالم روزانہ لکھتا ہے۔ چھ مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''صدق جدید'' میں حیدرآباد کی صحافت کا ذکر کیا تو لکھا کہ حیدرآباد میں ''سیاست'' کا اچھا پہلو اس کا مزاحیہ کالم ہے۔ انھوں نے بڑی تعریف کی تھی۔ اس کے بعد میں نے پھر طنز و مزاح کو اپنا لیا اور آج یہی میری شناخت ہے۔ اس میدان میں آنے کے بعد میں نے بہت لوگوں کو پڑھا۔ یوسفی کی ''چراغ تلے'' پطرس اور رشید احمد صدیقی، ابن انشا، شفیق الرحمن وغیرہ کو دوبارہ خوب پڑھا۔ مغربی مزاح نگاری کا بھی خوب مطالعہ کیا۔

سوال: آپ نے اپنے اصلی نام سے کب لکھنا شروع کیا؟

جواب: پہلی بار اپنے اصلی نام سے ایک مضمون یوم غالب پر 1964 میں ''ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں'' کے عنوان سے لکھا۔ یہ جلسہ اردو مجلس حیدرآباد کے زیر اہتمام ہوا تھا، جس کے سکریٹری منظور احمد صاحب کے اصرار پر یہ پڑھا تھا۔ اس میں تمام بڑے لوگ موجود

تھے۔ مخدوم محی الدین، حبیب الرحمن، ہارون خاں شیروانی وغیرہ۔

سوال: ہندوستان میں طنز ومزاح کو مقبولیت عطا کرنے میں آپ کی کوششوں کا بھی بڑا دخل رہا ہے۔ ہمارے قارئین کی معلومات کے لیے ان پر مختصر روشنی ڈالیے؟

جواب: 1966 میں زندہ دلان حیدرآباد کے بینر تلے میں نے ہندوستان کے مزاح نگاروں کی پہلی کانفرنس منعقد کی جس کی صدارت کرشن چندر نے کی اور مخدوم محی الدین نے افتتاح کیا۔

1985 میں طنز ومزاح پر بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں 12 ممالک سے لوگ آئے تھے۔ اس میں علاقائی زبانوں کے بھی اجلاس ہوئے۔ بلرام جاکھڑ (اسپیکر) نے اس کی صدارت کی تھی۔ زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے 38 سال سے ''شگوفہ'' نکل رہا ہے۔ طنز ومزاح کے فروغ میں اس رسالے اور اس کے مدیر کا بڑا رول رہا ہے۔ ہم نے جب یہ انجمن شروع کی تو بھارت چند کھنہ، رشید قریشی، سلیمان خطیب، حمایت اللہ، نریندر لوتھر نے طنز ومزاح کی طرف خصوصی توجہ کی۔ اس کے بعد پٹنہ، بھوپال اور ممبئی میں طنز ومزاح کو اسٹیج پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ 1968 میں ممبئی گیا جہاں ''سرینگا سنسد'' نے قہقہے کے عنوان سے پروگرام رکھا تھا۔ وہاں جب میں نے ''علامہ نارسا کی وفات مسرت آیات پر'' سنایا تو اسے بہت پسند کیا گیا۔ اس جلسے میں کنہیا لال نندن اور کئی بڑے ادیب وشاعر موجود تھے۔ دھرم ویر بھارتی (مدیر ''دھرم یگ'') نے ''بیٹھے ٹھالے'' کے عنوان سے کالم لکھنے کی پیشکش کی۔ پھر انھوں نے بڑی محبت سے میری تحریریں شائع کیں۔

سوال: آپ دہلی کب آئے؟

جواب: 1962 میں سرکاری ملازمت ملنے کے بعد حیدرآباد کے محکمۂ اطلاعات میں اردو اخبارات کی نگرانی سے متعلق کام انجام دیتا رہا۔ 1972 میں کمیٹی فار پروموشن آف اردو نے کام شروع کیا تو مجھے دہلی بلایا گیا۔ 1962 سے 1972 تک بحیثیت مزاح نگار میری کافی شہرت ہو چکی تھی۔ یہاں مجھے بے حد وسیع کینوس ملا۔ لوگ دہلی کو ظالم شہر کہتے ہیں لیکن مجھے یہاں جو پیار ملا اس کا جواب نہیں ہے۔ یہاں بھی میں نے شروع میں تکلیف اٹھائی۔ این سی ای آر ٹی میں ایڈیٹر بننے کے بعد وہاں میں نے سنجیدگی سے اردو کا کام شروع کرایا۔ میں نے جنتا پارٹی کے زمانے میں تین مہینے میں تیس درسی کتابیں تیار کرائیں۔ اس عہد میں مجھے پوری سہولیات بھی دی گئیں۔

سوال: دہلی میں آپ کی دیگر مصروفیات کیا رہیں؟

جواب: دہلی میں رہ کر میں صرف پڑھنے لکھنے تک محدود رہا۔ میرے سوشل ہونے کی وجہ سے ہر محفل میں میرا انتظار رہتا تھا۔ لیکن میں نے اس کا غلط فائدہ کبھی نہیں اٹھایا۔ یہاں سے میں امریکہ، سوویت یونین، خلیجی ممالک، یورپ، جاپان وغیرہ گیا۔ سرکاری سفر صرف ایک جاپان کا تھا۔ بقیہ جگہوں پر مجھے بطور ادیب بلایا گیا۔

سوال: آپ کو اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے ایوارڈ بھی ملے۔ ان کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

جواب: ایک عجیب بات یہ ہے کہ مجھے سب سے پہلا ایوارڈ اڑیا انجمن سرس ساہتیہ سمیتی نے دیا۔ ''دھرم یگ'' سے اڑیسہ کے فتورانند نے اڑیا میں میرے تراجم کیے تھے جو بہت پسند کیے گئے۔ وہاں مجھے ''ہاسیہ رتن'' کا خطاب دیا گیا۔ میرے مضامین پر ڈرامے لکھے گئے۔ جسٹس رنگ ناتھ مشرا کا بھی اس انجمن سے تعلق تھا۔ وہاں مجھے بڑی عزت ملی۔ بقیہ اعزازات تو مجھے بعد میں ملے۔

سوال: آپ کی ادبی زندگی پر آپ کے بھائیوں کا کتنا اثر رہا ہے؟

جواب: میری تربیت میں محبوب حسین جگر صاحب کا بڑا اثر تھا۔ ''غنچہ''، ''پھول''، ''تارے'' وغیرہ رسائل انھوں نے میرے نام جاری کرا رکھے تھے۔ ان کے علاوہ مجھے پڑھنے کے لیے کتابیں دیتے تھے۔ ان سے مجھے بڑا ڈر لگتا تھا۔ ان کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ دلآزاری کی چیزیں میرے مزاج میں نہیں آئیں۔ ابراہیم جلیس سے طنز و مزاح کے سلسلے میں متاثر ہوا۔

سوال: بچپن میں مستقبل کے لیے کوئی منصوبہ بندی؟

جواب: آزادی کے بعد ایسا بکھراؤ آیا کہ ہمارا گھر برباد ہو گیا اور کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وقت اور حالات جیسے رہے، اس حساب سے چلتا رہا۔ پیسہ جمع کرنے پر کبھی خاندان نے زور نہیں دیا۔ دوسروں کی مدد میں بھی کمی نہ کی۔

سوال: بچپن کی شرارتیں؟

جواب: ایسے کئی واقعات ہیں جن میں سے دو کا ذکر کر رہا ہوں۔ چچازاد بہن سے کم عمری (1956) میں میری شادی ہوئی۔ شادی اچانک طے ہوئی۔ عبدالقادر سروری صاحب کو دعوت نامہ دینے گیا تو بڑی شرم آئی، ہچکچاہٹ بھی تھی۔ انھوں نے پوچھا ''کس کی شادی ہے؟'' میں

نے کہا" چچازاد بہن کی شادی ہے۔" انھوں نے پوچھا" کس سے ہو رہی ہے؟" میں نے کہا" مجھ سے ہو رہی ہے۔" وہ بہت ناراض ہوئے، یہ سوچ کر کے کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگوں نے کچھ ایسے شاعر اور افسانہ نگار ڈھونڈ لیے تھے جو چائے اور کھانے پر کلام یا افسانہ سناتے تھے۔ ان سے صفحے کے حساب سے ہم لوگ پیسہ خرچ کراتے تھے لیکن جگر مرادآبادی نے ہمیں ایسا سبق سکھایا کہ زندگی بھر یاد رہے گا۔ 1955 میں جب وہ بزمِ اردو کی دعوت پر حیدرآباد آئے تو شہرت کی بلندیوں پر تھے۔ علامہ حیرت بدایونی کے بیٹے افضل محمد (جو بعد میں وائس چانسلر ہوئے) میرے دوست تھے۔ حیرت صاحب اور جگر صاحب کے دوستانہ مراسم تھے۔ افضل محمد نے وعدہ کیا کہ وہ انھیں کالج میں بلوا لیں گے۔ ہم نے اعلان کرادیا کہ مشاعرے میں جگر صاحب بھی شرکت کر رہے ہیں۔ ہم لوگ وقت معینہ پر ٹیکسی لے کر انھیں لینے پہنچ گئے۔ وہ شاہد صدیقی کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔ ہم نے کہا تو بولے" آپ نے مجھے مشاعرے میں بلایا نہیں۔ میں کیوں آؤں۔" ہم لوگوں نے بڑی منت سماجت کی لیکن وہ رضامند نہیں ہوئے۔ ہم لوگ مایوس ہو کر واپس آگئے۔ خوف اور شرم کے مارے مشاعرہ گاہ واپس آنے میں قدم ڈگمگا رہے تھے۔ ابھی ہم لوگ وہاں پہنچے ہی تھے کہ جگر صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے نہ کرایہ لیا اور نہ نذرانہ اور کسی سے اس واقعے کا ذکر بھی نہیں کیا۔ بڑی دیر تک سناتے رہے اور لوگ ڈوب کر سنتے رہے۔ اب کہاں وہ لوگ اور ایسی محفلیں!

سوال: آپ اپنے کالموں کے موضوعات کہاں سے اخذ کرتے ہیں؟

جواب: سیاسی بے اعتدالی، پانی یا بجلی کا مسئلہ، کوئی اور مسئلہ، سیاسی واقعات وغیرہ مختلف چیزوں سے موضوعات لیتا ہوں۔ میری کوشش رہی ہے کہ خود کو دہراؤں نہیں۔ کالم نگاری کی وجہ سے احمد ندیم قاسمی، شوکت تھانوی، مشفق خواجہ، ابراہیم جلیس اور نصراللہ خاں کی تحریریں خاص طور سے ذوق وشوق سے پڑھیں اور بہت کچھ سیکھا۔

سوال: آپ کس مزاح نگار سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے؟

جواب: مجھے مشتاق احمد یوسفی سب سے زیادہ پسند ہیں اور میں اردو کا سب سے پہلا اور بڑا اہم مزاح نگار غالب کو مانتا ہوں۔ اس میں اپنے آپ کا مذاق اڑانے کا جو حوصلہ ہے، کسی اور میں نہیں۔ ہاں یوسفی میں ہے۔ ابن انشا، مشفق خواجہ، یوسف ناظم، فکر تونسوی، وجاہت علی سندیلوی مجھے پسند ہیں۔ رضا نقوی واہی نے شاعروں میں اکبر الٰہ آبادی کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ہماری کانفرنس کے بعد طنز و مزاح کی مجلسوں کی روایت پھیلی ہے۔ پاکستان میں ضمیر جعفری، مجید لاہوری، دلاور فگار اور ہندوستان میں فرقت کاکوروی، احمد جمال پاشا، شفیق الرحمٰن وغیرہ نے اچھی پیروڈی لکھی ہے۔ انور مسعود، انعام الحق جاوید اچھے شاعر ہیں۔ عطا اللہ قاسمی، امجد اسلام امجد نے بھی اچھا طنزومزاح لکھا ہے۔

سوال: طنزومزاح اور انشائیہ میں کیا فرق ہے؟

جواب: Essay کی بنیاد پر یہ بحث چھڑی۔ سید محمد حسنین نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا۔ دراصل دونوں ایک ہی چیزیں ہیں۔ وزیر آغا کی تعریف میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔

سوال: ایک اچھے طنزومزاح نگار میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟

جواب: ہلکے پھلکے انداز میں لکھنا اور بلیغ نکتے پیدا کرنا طنزومزاح نگار کا کام ہے۔ زبان پر قدرت ہو، الفاظ سے غیر ضروری کھلواڑ نہ کیا جائے۔ باریک بینی، صورتحال کا کامیاب تجزیہ، انسان کی بوالعجبیوں کا مشاہدہ اور ان کو چابک دستی سے بیان کرنا ضروری ہے۔

سوال: ایک زمانہ تھا کہ برصغیر میں رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، فرقت کاکوروی، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، احمد جمال پاشا، عظیم بیگ چغتائی اور رضا نقوی واہی جیسے اعلیٰ پائے کے طنزومزاح نگار موجود تھے۔ آج ہندوستان میں آپ کے علاوہ یوسف ناظم ہیں اور پاکستان میں مشتاق احمد یوسفی کے علاوہ کوئی بڑا مزاح نگار نظر نہیں آتا۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے۔ کیا آج کا معاشرہ طنزومزاح کے لیے سازگار نہیں ہے؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے کلاسیکی ادب سے دور ہو رہے ہیں، خصوصاً نئی نسل۔ بہت کم لوگوں نے" آب حیات" یا داستانیں پڑھی ہیں۔ نئی نسل میں وہ مزاج ختم ہو رہا ہے۔ دوسرے آج کی زندگی کے تقاضے بھی ایسے ہو گئے ہیں کہ مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اردو میں بڑی حد تک مجلسی مزاح رہا ہے۔ جملے بازی، پھبتی کسنا، درباروں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ مشینی زندگی ہو گئی۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آدمی اپنے سروکار سے مخلص رہے۔ موسیقی والے ریاض کرتے ہیں۔ لیکن لکھنے کے لیے جس قدر مشق کی ضرورت ہے وہ نئی نسل نہیں کر رہی ہے۔

سوال: مشتاق احمد یوسفی کی خاص بات جو آپ کو پسند ہو؟

جواب: یوسفی دنیا کی کسی بھی زبان کے طنز و مزاح نگاروں سے بہت آگے ہیں۔ ان کی سوچ بھی بہت منفرد ہے۔ وہ لفظ تو چھوڑیے، کاما بھی سوچ سمجھ کے استعمال کرتے ہیں۔ وہ ایسا لفظ استعمال کرتے ہیں کہ اس کے نئے معنی روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑے کرافٹ مین ہیں۔ وہ جب تک مطمئن نہیں ہو جاتے، کوئی تحریر چھپنے کے لیے نہیں بھیجتے۔ وہ Perfectionist ہیں۔ انھوں نے چار کتابیں لکھی ہیں لیکن وہ حرف آخر ہیں۔ غالب نے ڈیڑھ سو سال پہلے طنز و مزاح کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا تھا، اس کا نقطۂ عروج مشتاق احمد یوسفی ہیں۔ میں ابن انشا کو بھی بڑا مزاح نگار مانتا ہوں۔ وہ ہمیشہ بے ساختہ لکھتے تھے۔ انھوں نے بے ساختگی میں جو برجستگی پیدا کی اور جذبے کی نزاکتوں کو جس طرح پیش کیا، انسان کی اوبڑ کھابڑ زندگی کو جس طرح نمایاں کیا، وہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں شاید ہی ایسا بے ساختہ لکھنے والا ملے۔ زبان کا ہر پہلو (Shade) ان کے سامنے تھا۔ ہر طبقے کے لوگوں کی زبان اور نفسیات پر ان کو قدرت حاصل تھی۔

سوال: اصلاح معاشرہ میں طنز و مزاح نگار کا کیا رول ہے؟

جواب: جب مزاح نگار کسی کا مذاق اڑاتا ہے تو بہت سی کام کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ لیکن اسے اصلاح معاشرہ تک محدود کرنا غلط ہے۔ دوسروں میں خوشیاں بانٹنا خود نیک کام ہے۔ یہ کام مزاح نگار کرتا ہے۔ یوسفی کا کہنا ہے کہ طنز و مزاح سے اگر قوموں کی اصلاح ہوتی تو عربوں کو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سوال: آپ نے دہلی میں ایک طویل مدت تک قیام کرنے کے بعد حیدرآباد میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: دہلی کا مجھ پر گہرا اثر رہا ہے۔ یہ شہر مجھ پر بڑا مہربان رہا ہے۔ مجھے یہاں ہر طبقے میں محبت ملی، جو شاید ہی کسی کو ملے۔ مجھے اپنے بچوں کے سعودی عرب چلے جانے کی وجہ سے حیدرآباد آنا پڑا۔ بیٹی دہلی میں رہتی ہے۔ سنہ 2000 میں گھٹنے کی سرجری کرائی جو ناکام ہو گئی۔ اکتوبر 2000 سے میرے مسائل شروع ہوئے۔ چلنے پھرنے سے معذور ہونے لگا۔ کئی مہینے اسپتال میں رہا۔ دہلی کی سرگرمیوں میں شرکت، آنا جانا، زندگی سے جڑے رہنا ضروری ہے۔ میرے بڑے بیٹے کے بچے بڑے ہو گئے۔ ان کی تعلیم اور نگہداشت کے لیے مجھے حیدرآباد آنا پڑا۔ لیکن مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں دہلی ضرور پہنچتا ہوں۔ یہاں رہ کر بھی میرے پاس حیدرآباد سے زیادہ دہلی سے فون آتے ہیں۔ حیدرآباد میرا محبوب شہر ہے۔ لیکن وہاں میرے پرانے ساتھی اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ پورا حیدرآباد مجھے چاہتا ہے لیکن دوستوں کی کمی کھلتی ہے۔ مجھے بڑی تنہائی محسوس ہوتی ہے۔

سوال: آپ کو اپنی کون سی تخلیق سب سے زیادہ پسند ہے؟

جواب: مجھے لکھ دینے کے بعد کوئی مضمون پسند نہیں آتا۔ محفلوں میں پڑھنے کے بعد داد ملنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اچھے ہیں۔ میں قلم برداشتہ لکھتا ہوں۔ اس کی تعریف مشتاق احمد یوسفی نے بھی کی۔ یہ ان کی عظمت تھی کہ دبئی میں نثری مزاح کا جشن منایا جانے لگا تو یوسفی نے میرے لیے کہا کہ آپ میری بجائے مجتبیٰ حسین کا جشن منایئے جو مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ان لوگوں نے جو سوینیر نکالا وہ میرے حوالے سے یادگار ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل نے اردو زبان و تعلیم کے فروغ کے لیے جو کوششیں کی ہیں، ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: قومی اردو کونسل کے اغراض و مقاصد بہت نیک ہیں اور کام بھی مسلسل ہو رہا ہے۔ یہاں سے اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن اگر کونسل اردو زبان کو نصاب میں شامل کرانے کے لیے کوئی عملی قدم حکومت ہند کے دوسرے اداروں کے مشورے کے ساتھ اٹھائے تو یہ ایک عظیم خدمت ہوگی کیوں کہ نصاب میں شمولیت کے بغیر زبان کا فروغ ممکن نہیں ہے۔ کونسل کے دائرۂ کار کو وسیع کرنے کے سلسلے میں جو عملی دشواریاں ہیں ان کی طرف حکومت کے سربرآوردہ اصحاب کو توجہ دلانا چاہیے۔

سوال: ''اردو دنیا'' کے قارئین کے نام آپ کا پیغام؟

جواب: ''اردو دنیا'' ایک اہم اور موثر رسالہ ہے جس کے ذریعے صحیح معنوں میں نہ صرف اردو کی حالت کا بلکہ اردو کے ادیبوں کے حالات کا بھی علم ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک مکمل اور بھرپور رسالہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ نئی نسل میں اس کی پذیرائی ہوگی۔ میری نیک تمنائیں ''اردو دنیا'' کے ساتھ ہیں۔

□□□

رابطہ:
502, Maphar Regency
A.C. Guards
Hyderabad-500004

شمس الرحمن فاروقی

# اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

گذشتہ شمارے سے ہم نے "اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف" کے عنوان سے ایک نیا کالم شروع کیا ہے جس میں اردوروزمرہ اور اردو زبان کے بارے میں قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جائیں گے۔ شرط یہ ہے کہ ایک وقت میں تین سے زیادہ سوالات نہ پوچھے جائیں اور سوالات کا تعلق الفاظ کے استعمال، روزمرہ میں ان کے صرف اور ان کے معنی کے بارے میں ہو۔

(ادارہ)

**سوال: اردو صحافت میں "مہلوکین" رائج ہے۔ کیا یہ لفظ صحیح ہے؟**

جواب: ''وہ جو ہلاک کیے گئے/ہلاک ہوئے'' کے معنی میں یہ لفظ بعض اخباروں نے رائج کرنا چاہا ہے، لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اردو میں لفظ ''ہلاک'' ہی فاعلی اور مفعولی معنی دیتا ہے۔ ''مہلوک'' غیر ضروری اور موضوعی لفظ ہے۔ اگر کسی کو عربی بگھارنے کا بہت جی چاہے تو ''مستہلک'' کہے، ورنہ ''ہلاک'' بہت کافی ہے:

غلط: زلزلے میں ہزاروں مہلوک ہوئے۔

صحیح: ...ہلاک ہوئے۔

صحیح لیکن نامناسب: ...مستہلک ہوئے۔

غلط: مہلوکین کی تعداد کا پتہ نہ چل سکا۔

مناسب اور صحیح: ہلاک ہونے والوں...

صحیح لیکن نامناسب: مستہلکین...

اسی طرح، ''ہلاک'' میں ''مارنا، مارا جانا'' کے معنی خود موجود ہیں، میر

کرتا نہیں قصور ہمارے ہلاک میں
یا رب یہ آسمان بھی مل جائے خاک میں

بعض لوگوں نے ''ہلاکت'' ایک غیر ضروری لفظ بنا لیا ہے۔ یہ ابھی ہر جگہ رائج نہیں ہوا ہے، اگر ترک ہو سکے تو بہتر ہے۔

**سوال: "صحیح" اور "سہی" کے استعمال کی وضاحت فرمائیں۔**

جواب: ''سہی'' دراصل ''صحیح'' کی ہی ایک شکل ہے اور پہلے ''صحیح'' کے معنی میں بولا جاتا تھا۔ میر کے دیوان دوم میں ہے

حرف غلط کو سن کر درپے نہ خوں کے ہوتا
جو کچھ کیا ہے میں نے پہلے اسے سہی کر

شروع شروع میں کلمۂ تاکید کے طور پر ''نہ صحیح، تو صحیح، ہی صحیح'' اور ''نہ سہی، تو سہی، ہی سہی'' دونوں رائج تھے۔ یعنی جس طرح ہم ''سنو تو سہی، یہ بھی نہ سہی'' وغیرہ کہتے ہیں اسی طرح پرانے لوگ ''سنو تو صحیح، یہ بھی نہ صحیح'' وغیرہ لکھتے تھے۔ بولنے میں بہر حال تلفظ ایک ہی تھا۔ دیوان یقین مرتبہ فرحت فاطمہ میں ایک پوری غزل ہے، مطلع

دکھ تو دیتا ہے کردوں میں تجھ کو حیراں تو صحیح
باغباں اب کے اجاڑے یوں گلستاں تو صحیح

ظاہر ہے کہ یہاں شاعر نے ''تو سہی'' کے بجائے ''تو صحیح'' لکھا ہے۔ داستان امیر حمزہ میں ''تو صحیح'' بجائے ''تو سہی'' جگہ جگہ ملتا ہے۔ اب ''سہی'' بمعنی ''صحیح [درست، بجا، راست]'' رائج نہیں اور ''صحیح'' بمعنی ''سہی [کلمۂ تاکید]'' بھی رائج نہیں۔ لیکن مراٹھی میں ''دستخط'' کو ''سہی'' کہتے ہیں جو وہی ہمارا ''صحیح/سہی'' ہے، کیونکہ کوئی کاغذ اسی وقت تصدیق پاتا (صحیح مانا جاتا ہے) جب اس پر دستخط ہوں۔ اردو کے روزمرہ میں ''سہی'' اب محض کلمۂ تاکید ہے۔ ''سہی/تو سہی/نہ سہی/ ہی سہی'' وغیرہ سب درست ہیں اور ''صحیح'' کے اصل معنی سے ان کا تعلق محض دور کا ہے۔

**سوال: مصالحہ اور مسالہ میں کون سا درست ہے؟**

جواب: ضامن علی جلال لکھتے ہیں کہ یہ لفظ عربی ''مصالح'' پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ ان کے تتبع میں ''نور'' اور دیگر کئی لغات نے یہی موقف اختیار کیا

ہے۔ بظاہر ان لوگوں کا خیال ہے کہ عربی لفظ "مصلحت" کی جمع "مصالح" کو اردو میں لے لیا گیا ہے اور معنی بدل دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا بھی یہی خیال تھا۔ ان لوگوں کا خیال یہ بھی تھا کہ اردو میں "مسالا" لکھنا چاہیے۔ یہ بات کہیں صاف نہیں ہوئی کہ عربی "مصالح" جو بالکل مختلف لفظ ہے اور جس میں لام مکسور ہے، اردو کا "مصالح" مع لام مفتوح کیسے بن گیا اور اس کے معنی اس قدر مختلف کیوں کر ہوئے؟

اردو کے جدید علما نے معاملے میں الجھن ڈال دی۔ انھوں نے اس بحث پر بہت کاغذ اور روشنائی صرف کی ہے۔ جھگڑے کی بنا یہ ہے کہ Spices کے معنی میں "مصالحہ" عربی میں نہیں ہے، تو پھر اردو میں کیوں کر ہو؟ اسی لیے کئی لوگوں نے "مصالحہ" کی جگہ "مسالہ" تجویز کیا۔ لیکن اب جھگڑا یہ پڑا کہ "مسالہ" میں "ہائے مختفی" ہے اور "ہندی" میں ہائے مختفی ہے نہیں، لہٰذا اسے "مسالا" لکھنا چاہیے۔ "نور" [نوراللغات] میں تو "مصالح/مصالحہ" درج ہی نہیں کیا گیا ہے۔ صاحب "نور" نے لکھا ہے کہ دلی میں "مصالح" رائج ہے لیکن چونکہ تلفظ اور املا میں مطابقت نہیں لہٰذا تلفظ کی مطابقت کرتے ہوئے لکھنؤ والوں کی طرح "مسالا" لکھنا چاہیے۔ صاحب "نور" نے یہ بات نظر انداز کر دی کہ تلفظ کی حد تک تو "ص/س" اور "ہ/الف" ایک ہی ہیں، پھر یہ کیونکر طے ہو کہ صحیح املا "مسالا" ہے، "مصالا/مصالہ/مسالہ" نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ پرانے زمانے میں "مصالح" ہی رائج تھا۔ "مصالحہ" بعد کی صورت ہے اور "مسالا/مسالہ" تھا ہی نہیں۔ چنانچہ شیکسپیئر کے لغت میں نہ "مصالحہ" ہے اور نہ "مسالہ/مسالا"، صرف "مصالح" درج ہے۔ پلیٹس کے یہاں بنیادی اندراج "مصالح" ہے، لیکن اس نے "مسالا" اور "مصالا" دونوں لکھے ہیں اور بتایا ہے کہ یہ "مصالح" کی تصحیف ہیں۔ بہر حال، کسی بنا پر "مصالح" سے "مصالحہ" بن گیا اور یہی اردو کا روزمرہ ٹھہرا لیکن "مصالحہ" کے معنی وہی رہے جو "مصالح" کے تھے۔

یہ خیال غلط ہے کہ اردو "مصالح/مصالحہ" کی اصل عربی لفظ "مصلحت" کی جمع ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ لفظ عربی "مصلح" (بمعنی "سدھارنے والا") کی جمع ہے۔ "مصالح" (مع اول مفتوح، چہارم مکسور) کے معنی ہیں: "چیز ہا کہ بداں اصلاح چیز ہا دہند، ضد مفاسد" ("منتخب اللغات")۔ یعنی عربی میں "مصالح" وہ چیزیں ہیں جن سے دوسری چیزوں کو درست کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا مصالحہ یہی کام کرتا ہے کہ وہ کھانے کی چیزوں کو درست بناتا ہے۔

فارسی میں لفظ "مصالح" (میم مفتوح، لام مکسور) دو معنی میں موجود ہے: اول، وہ چیزیں جو عمارت بنانے میں استعمال ہوتی ہیں، اور دوم، وہ چیزیں جو کھانے کو لذیذ بناتی ہیں۔ انھیں مصالح گرم کہتے ہیں ("بہار عجم"؛ "فرہنگ آنند راج")۔ یہاں سے ہمارے روزمرہ "گرم مصالحہ" کی بھی اصل معلوم ہوئی، کہ مصالحہ وہ چیز ہے جس سے کھانا "گرم" یعنی لذیذ ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، شروع شروع میں اردو کا لفظ "مصالح" تھا، بعد میں "مصالحہ" ہو گیا۔ دلی میں اکثر لوگ، اور دلی کے باہر بھی بہت سے لوگ "مصالحہ" ہی لکھتے ہیں۔ لیکن "مسالا/مسالہ" کے ذریعے غلط بحث پیدا ہونے کی وجہ سے اب "مسالا/مسالہ" بھی لکھا جانے لگا ہے۔ "اردو لغت، تاریخی اصول پر" میں جو شواہد ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ متذکرہ بالا تمام معنی میں (اور کئی دوسرے معنی میں بھی) "مصالحہ" زیادہ مقبول املا تھا اور آج بھی اسے نامقبول نہیں کہہ سکتے۔

آج کل زیادہ تر لوگ Spices کے معنی میں "مصالحہ" اور "مصالحہ جات" لکھتے ہیں اور کپڑوں وغیرہ پر جو سونا، چاندی، گوٹا، بادلہ، ستارہ وغیرہ لگایا جاتا ہے، اس کے لیے "مسالہ/مسالا" لکھتے ہیں۔ عمارت بنانے میں جو چونا، گارا، سیمنٹ استعمال ہوتا ہے اسے بھی "مسالہ/مسالا" لکھتے ہیں۔ اسی طرح، محاورہ "مرچ مسالہ لگانا" ہے (بمعنی کسی بات کو بڑھانا چڑھانا)۔ اسے عام طور پر برے معنی میں برتتے ہیں:

انھوں نے میری باتیں خوب مرچ مسالہ لگا کر سب سے کہیں۔

کسی معاملے کے نکات وغیرہ، یعنی Matter کے معنی میں صرف "مسالہ" لکھتے ہیں، مثلاً:

مجھے ان کے خلاف بہت کچھ مسالہ مل گیا ہے۔

ملحوظ رہے کہ "مصالحہ" کے اور بھی بہت سے معنی ہیں، مثلاً کوئی بھی کیمیائی مرکب، پاوڈر، دھنیا وغیرہ جو محرم میں بانٹتے ہیں۔ ان سب معنی میں "مصالحہ" لکھنا بہتر ہے لیکن "مسالہ" کو غلط نہ کہیں گے۔

**(سوالات از راشد جمال فاروقی، رشی کیش)**

□□□

**رابطہ:**
29-C, Hastings Road
Civil Lines
Allahabad (U.P.)

سید صفی اللہ

# نصاب کی تیاری: چند رہبر اصول

نصاب کی ترتیب یا تیاری کی بات آتی ہے تو ذہن میں پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ نصاب کس کے لیے؟ یعنی پڑھنے والے کون ہوں گے جن کے لیے نصاب تیار کیا جا رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس نصاب کا مقصد اور معیار کیا ہو؟ گویا مقصد اور معیار وہ چیزیں ہیں جن کی اساس پر نصاب کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اگرچہ آگے اور بھی شرائط آتی ہیں اور وہ شرائط اہم بھی ہیں مگر ان کی حیثیت اساسی نہیں ہے۔ البتہ وہ عمارت میں حسن اور مضبوطی پیدا کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ مقصد اور معیار میں بھی اولیت مقصد کو حاصل ہے۔ معیار اس کے تابع ہوتا ہے اور مقصد کو بامعنی بناتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے معیار ہی کی تعیین ہونی چاہیے۔

ترتیب نصاب کے سلسلے میں ذیل میں بعض پہلوؤں پر اظہار خیال کیا جا رہا ہے اور مقصد و معیار کی تعیین کے لیے ڈگری سطح پر حصہ اوّل (پارٹ۔1) کے نصاب کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے پہلے معیار کی تعیین ہونی چاہیے۔

معیار کے سلسلے میں کہیں بھی واضح طور پر ہدایات نہیں ملتیں۔ البتہ مختلف یونیورسٹیوں کا نصاب ہمارے سامنے ہے جس کی روشنی میں ہم اس پہلو پر غور کر کے کسی قطعی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں نصاب میں شعری حصہ ہوتا ہے۔ نثری ادب پارے ہوتے ہیں کچھ حصہ قواعد کا ہوتا ہے، کچھ تاریخ ادب اردو اور ایک ہلکی سی کتاب برائے غیر تفصیلی مطالعہ۔

عام طور پر اعلیٰ درجات میں اور خاص طور پر کالج کی سطح پر زبان کی تدریس کا مقصد یہی سمجھا جاتا ہے کہ طلبہ یا طالبات میں اتنی قابلیت پیدا ہو جائے کہ وہ عبارت کو صحیح طور پر پڑھ لیں۔ بغیر دقت کے اسے سمجھ لیں اور اپنا مافی الضمیر آسانی کے ساتھ اس زبان میں ادا کر سکیں۔ اسے مقصد کہیے یا نہ کہیے، حاصل تو یہی ہے۔ لہٰذا گریجویشن سطح پر حصہ اول (پارٹ۔1) میں بھی تدریس کا حاصل کم از کم اتنا تو ہونا ہی چاہیے لیکن اگر مقصد کو یہیں تک محدود کر دیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لیے نثری حصہ کے ساتھ شعری حصہ اور تاریخ زبان و ادب کو نصاب میں شامل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کام تو مکالماتی انداز کے اسباق سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ کچھ اور زبان سیکھنے کی مشقوں پر دے کر بھی اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ قدیم نثری ادب پاروں کی تدریس اور اساتذہ کے کلام کی تشریح تو خواہ مخواہ کی محنت ہی سمجھی جائے گی!

غالباً 1969 میں صوبہ تمل ناڈو میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ گریجویشن سطح پر زبان کی تدریس کی کیا ضرورت ہے۔ زبان کی تدریس کو اسکول ہی پر ختم کر دینی چاہیے اور کالج کی تعلیم کو صرف خصوصی عموم کے لیے مختص کر دینی چاہیے۔ یہ سوال اس شدومد کے ساتھ اٹھایا گیا تھا کہ کالج سے زبان کی تدریس ختم ہی ہوتی نظر آئی لیکن پھر معاملہ دب گیا، معاملہ کے دب جانے کی کچھ سیاسی وجوہات بھی ایسی ہونگی۔ لیکن اکیڈمک یا علمی سطح پر جو وجہیں پیش کی گئیں وہ یہ تھیں کہ طلبہ یا طالبات کو کسی تکنیک کا ماہر بنانا ہی نہیں ہے بلکہ انھیں ایک اچھا، بااخلاق انسان اور ذمہ دار شہری بھی بنانا ہے اور یہ کام صرف ادب کی تعلیم سے انجام پا سکتا ہے۔ گویا یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ یہ اہم فرض ادب ہی انجام دے سکتا ہے۔

اس سے زبان کی تدریس کے مقصد کا ایک یہ پہلو بھی ہمارے سامنے آ گیا کہ نصاب طلبہ و طالبات کی ذہنی تربیت بھی کرتا ہے۔ ان کے دلوں میں تہذیبی اقدار کے لیے جگہ بناتا ہے۔ اس بات کو اور وضاحت کے ساتھ کہنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ نصاب کا متن، پڑھنے والوں کے ذہن کی کھڑکیاں کھولتا ہے، ان کے سوچنے کے انداز میں تبدیلیاں لاتا ہے، شخصیت سازی اور کردار کی تعمیر میں مدد کرتا ہے، صحیح اور صحت مند خیالات کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے۔ حب الوطنی، قومی یکجہتی، ملی ہم آہنگی اور انسان دوستی جیسے جذبات و اقدار کی آبیاری کرتا ہے۔ گویا (زبان و ادب کا) نصاب تہذیبی اور اخلاقی اقدار کا مخزن و منبع ہے۔

یہ رہا دوسرا پہلو۔ اس کا ایک تیسرا پہلو بھی ہے۔

اگر کوئی امیدوار زبان و ادب لے کر ایم۔اے۔ کرنا چاہے تو اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس نے اس زبان و ادب میں گریجویشن کیا ہو یا گریجویشن کورس میں بطور ایک پارٹ کے وہ زبان پڑھی ہو۔ اگر کوئی اردو میں ایم۔اے۔ کرنا چاہے تو اس کے لیے بھی یہی شرط ہے یعنی اس نے کم از کم ایک پارٹ میں اردو پڑھی ہو۔

اگر کسی نے فلسفہ اخلاقیات میں گریجویشن کیا ہو تو وہ اردو ایم.اے. کورس میں داخلہ کا اہل نہیں ہوگا۔ اگر سماجیات میں گریجویشن کیا ہو تب بھی داخلہ کا اہل نہیں ہوگا حالانکہ یہ اسباق اخلاقی و سماجی موضوعات ہی ہیں اور پچھلی سطور میں ہم نے دیکھا کہ اخلاقی اور سماجی اقدار کا حصول ہی زبان او ادب کی تدریس کا منشا ہے۔ ہاں اگر کسی نے حصہ اوّل یا حصہ دوم (پارٹ۔ا یا پارٹ۔II) کے تحت وہ زبان لے رکھی تھی تو داخلہ کا مجاز ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی تدریس کا منشا و مقصد اخلاقی و سماجی اقدار پیدا کرنے سے آگے بھی کچھ ہے۔ آخر وہ کیا مقصد ہے جس کی توقع گریجویشن سطح کی تدریس سے کی جاتی ہے اور جو ایم.اے. میں زبان و ادب پڑھنے میں مدد کرتا ہے۔

دراصل ایم.اے. کی سطح پر ادب کا مطالعہ کافی وسعت اور گہرائی کا حامل ہوتا ہے اور اس کے لیے امیدوار میں اچھے ادبی ذوق کی توقع کی جاتی ہے۔ ہو نہ ہو یہی وہ توقع ہوگی جو گریجویشن سطح پر ادب کے مطالعے کو مشروط بناتی ہے، چاہے وہ پارٹ ا کے تحت ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ پارٹ ا کے تحت زبان کے پڑھنے کو بھی اس ڈسپلن میں گریجویشن کرنے کے متبادل (مساوی) مانا گیا ہے یعنی پارٹ ا کا نصاب بھی طلبہ و طالبات میں وہی ادبی ذوق پیدا کرتا ہے جو ادب میں گریجویشن کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ گویا طلبہ و طالبات میں ادبی ذوق پیدا کرنا یا ادب کا چسکہ پیدا کرنا پارٹ ا کی تدریس کا بھی مقصد ہے۔

ان سارے نکات کو مجتمع کیا جائے تو مقصد کی جو مکمل صورت ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ مطلوبہ سطح پر زبان کی تدریس (i) طلبہ میں لکھنے پڑھنے اور بولنے کی قوت میں اضافہ کرتی ہے (ii) وہ ایک اچھا انسان اور ذمہ دار شہری بناتی ہے اور (iii) اس سے طلبہ کے اندر ادبی ذوق اور ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اس سطح پر تدریس کے دوران شعر و ادب کے اچھے نمونوں سے طلبہ کو متعارف کرانے کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ قواعد کی مشق بھی صحت زبان کی اہمیت کو ان پر واضح کرنے میں مدد دیتی ہے۔ زبان و ادب کی تاریخ کے ذریعے وہ اپنے ادبی سرمایے، شعرا کی عظمت اور ادیبوں کے بے مثل کارناموں سے واقف ہوتے ہیں اور نان ڈیٹیلڈ اسٹڈی یا غیر تفصیلی مطالعہ کے ذریعہ کتابوں کے مطالعے کی عادت ان میں پڑتی ہے۔

مقصد کی تعیین کے بعد معیار کے تعین کی منزل آتی ہے۔ معیار کے دو پہلو ہیں۔ زبان کا معیار اور مواد کا معیار۔

زبان کے معیار کے سلسلے میں درجہ بندی یا Graduation کا عمل بہت ضروری ہے یعنی یہ دیکھنا ضروری ہے کہ نچلے درجات میں کیا معیار رہا ہے تاکہ اس کی اساس پر مجوزہ نصاب کا معیار مقرر کیا جاسکے۔

مواد کے معیار سے مراد یہ ہے کہ اسباق کا متن اور موضوع پڑھنے والوں کی عمر، ذہنی سطح اور ذوق کے مطابق ہو اور افادی پہلو کا بھی حامل ہو اور اگر کسی زنانہ کالج کا نصاب بنانا ہو تو مواد کے انتخاب میں اس صنف کی پرداخت اور ذہنی تربیت اور ضروریات کو بھی مدنظر رکھا جائے گا۔

**شعری اور نثری حصوں کا انتخاب:**

چونکہ اس انتخاب میں بہترین اور صحیح زبان کی نمائندگی مقصود ہوتی ہے اور اس میں مختلف اسالیب کے نمونے بھی پیش کرنے پڑتے ہیں اس لیے اسے اساتذہ وقت کے کلام اور ادب پاروں کے انتخاب پر مشتمل ہونا چاہیے جس سے صحیح ادبی ذوق کی نمو ہو سکے۔ اس سلسلے میں میں یہ عرض کروں گا کہ:

(i) یہاں قدیم زبان کے نمونوں سے اجتناب بہتر ہے بلکہ رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب یا ولی اور سراج کی شاعری یا دکنی ادب کے نمونوں کو شامل ہی نہ کیا جائے۔ ان کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اس سطح پر اس حصہ کی شمولیت افادی پہلو کے بڑے حصے کو کھا جائے گی۔

(ii) عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ بعض مضامین آگے پیچھے کی کلاسوں میں بار بار آتے رہتے ہیں۔ اس سے نہ صرف پڑھنے والوں کی دلچسپی میں کمی آجاتی ہے بلکہ نصاب خود بھی نیاپن کھو دیتا ہے۔ اس لیے یہ احتیاط بھی مدنظر رہے۔ وہ مضامین جو پچھلی یا نچلی کلاسوں میں آچکے ہوں، دوبارہ نصاب میں شامل نہ ہونے پائیں۔

(iii) نصاب کا پچاس فیصد (50%) حصہ پچھلے پچاس برسوں کے درمیان تخلیق پائے ہوئے ادب پر مشتمل ہو کیونکہ اس وقفہ میں ایک طرف زبان میں کافی بدلاؤ آیا ہے تو دوسری طرف موضوعات اور اندازِ نظر میں بہت زیادہ تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ یہ اسباق آج کی نسل کے لیے زیادہ فائدہ مند اور حالات حاضرہ سے زیادہ مطابقت کے حامل ہوں گے۔

(iv) نصاب اگر مغربی بنگال، راجستھان، مہاراشٹرا، کرناٹک، تمل ناڈو یا کیرلہ جیسے اردو مراکز سے ہٹے ہوئے علاقوں کا ہو تو اس میں مقامی ادبا و شعرا کی شمولیت بھی ضروری ہے مثلاً تمل ناڈو کو لیجیے تمل ناڈو کے لیے یہ بہت ضروری ہے کیونکہ یہاں اردو کا چلن دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں کم ہے اور کچھ ہی ضلعوں تک محدود ہے۔ 29 ضلعوں میں زیادہ سے زیادہ پانچ یا چھ ضلعے ہی ایسے ہیں جہاں اردو کا چلن ہے۔ خوف اس بات کا ہونے لگا ہے کہ نئی نسل کے ذہنوں میں یہ بات نہ بیٹھ جائے کہ اردو سے ہمارے علاقے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ غیریت کے اس متوقع احساس کا فوری اور موثر طور پر رد ضروری ہے۔ یہاں کے شعرا اور ادبا

کے ادب کے شمولیت سے نصاب میں اپناپن پیدا ہو سکے گا۔ ہم بتا سکیں گے کہ اردو کے شاعر اور ادیب ہمارے صوبے میں بھی ایسے ہی موجود ہیں جیسے کسی اور صوبے میں۔ البتہ یہ احتیاط ملحوظ رہے کہ یہ شمولیت جلیل القدر شعرا و ادبا یعنی ایسے شاعروں تک جن کا کلام اغلاط سے پاک ہو اور ایسے ادیبوں تک جو صاف اسلوب ہوں محدود رکھی جائے (صرف اونچی سطح کے لیے یہ احتیاط ہے) اور تناسب کی سفارش بھی صرف 20% کی کی جاتی ہے۔ مثلاً دس نظموں/غزلوں میں دو مقامی شعرا کی نظمیں غزلیں۔ اسی طرح اگر پانچ نثری اسباق ہوں تو ایک مقامی ادیب کا۔

(v) نصاب کے وسیلے سے اپنے علاقہ کے سرپرستان علم و ادب و ملت (Philothrophis) اور قومی رہنماؤں اور ان کی خدمات سے بھی موجودہ نسل کو متعارف کرایا جا سکتا ہے جیسے تمل ناڈو میں جمال محمد راؤڈر، ڈاکٹر عبدالحق اور جسٹس بشیر احمد سعید جن کی ملی، علمی اور قومی خدمات مسلم ہیں۔

(vi) جب تک کوئی مجبوری نہ آن پڑے، مرتبین کتاب اپنا کوئی سبق شامل نصاب نہ فرمائیں۔ مجبوری کی صورت میں وہ سبق یا مضمون شخصی نام سے نہیں بلکہ ''مرتب'' یا ''مرتبین'' کے الفاظ کے تحت شامل کتاب ہو۔

تاریخ ادب کے نصاب کو بھی نئے ڈھنگ سے ترتیب دیا جائے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ و طالبات پر کم از کم اس قدر ظاہر ہو جائے کہ اردو زبان اپنا ایک عظیم ماضی رکھتی ہے۔ یہ کوئی بے جڑ کا پودا نہیں بلکہ بارآور درخت ہے جو ملک کے طول و عرض پر سایہ فگن ہے اور یہ کہ کتاب میں شامل شعرا و ادبا کی عظمت اور ادبی خدمات کا اندازہ ہو سکے۔ لہٰذا آغاز و ارتقائے زبان و ادب کے مدارج کو دو تین یا زیادہ سے زیادہ چار مضامین میں سمیٹنے کے بعد بہت ہی اہم شعرا اور ادبا کو شامل نصاب کیا جائے۔ تاریخ ادب میں علاقائی ادب کی تاریخ پر بھی ایک باب ہو مثلاً اگر نصاب تمل ناڈو کے یونیورسٹیوں یا کالجوں کے لیے ہو تو تاریخ ادب میں تمل ناڈو پر ایک باب ہو۔

قواعد اردو کی تدریس روایتی طریقوں سے ہٹ کر جدید طرز پر کی جائے۔

نان ڈیٹیلڈ اسٹڈی یعنی غیر تفصیلی یا سرسری مطالعے کے لیے الگ سے کتاب ہو۔ تمل ناڈو میں یہ بات رواج پانے لگی ہے کہ اسے ٹیکسٹ بک کے ساتھ ملا کر چھاپ دیا جاتا ہے۔ اسے نصاب کی کتاب میں جوڑ دینا اصولاً غلط ہے۔ اس سے اضافی مطالعے کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے طلبہ میں نصاب سے ہٹ کر دوسری کتابیں پڑھنے کی عادت پڑے۔ غیر تفصیلی مطالعہ یا اضافی مطالعہ (سرسری مطالعہ) چونکہ طلبا یا طالبات کے خود پڑھنے کی چیز ہے اس لیے اس کے معیار میں ڈھیل دی جا سکتی ہے۔

**کچھ مزید باتیں جو ہماری توجہ کی مستحق ہیں:**

مواد یعنی Contents کے متعلق بحث ہو سکتی ہے۔ اختلاف رائے بھی ہو سکتا ہے لیکن مندرجۂ ذیل باتیں ایسی ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔

1. کتاب میں اول سے آخر تک کتابت کی کوئی غلطی نہ رہنے پائے۔ نصابی کتاب کے سلسلے میں یہ بہت ضروری ہے۔ اس لیے پروف ریڈنگ میں حتی الامکان محنت اور پوری ذمہ داری سے کام لیا جائے۔
2. اگر سبق کسی کتاب سے ماخوذ ہے تو وہ اس کتاب کے مصنف کے نام سے ہی ہونا چاہیے تاکہ مدرس، مصنف کے اسلوب اور طرز بیان پر تدریس کے دوران روشنی ڈال سکے۔ اگر سبق کسی کتاب کی تلخیص ہے تو سبق کے نیچے کتاب اور اس کے مصنف کی نشان دہی ہونی چاہیے۔ تلخیص کرنا یا اسے پیش کرنے کا حق صرف درسی کتاب کے مرتبین کو پہنچتا ہے۔ اس لیے تلخیص کردہ سبق کے لیے تلخیص کرنے والے کے نام کی جگہ صرف ''مرتبین'' لکھ دیا جائے۔

□□□

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولین ہے۔

عبدالعلیم قدوائی

# ہندوستان میں ابتدائی تعلیم کی صورت حال

ہمارے دستور نے چودہ سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کے انتظام کا وعدہ کیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت ہند نے مختلف قسم کے پروگرام شروع کیے ہیں جن میں سب سے زیادہ اہمیت سروشکشا ابھیان 2001 کو حاصل ہے جس کا نشانہ یہ ہے کہ 2010 تک پورے ملک میں ابتدائی تعلیم کا اطمینان بخش انتظام ہو جائے۔ اس سلسلے میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن، نئی دہلی نے ملک میں ابتدائی تعلیم کی حالت پر ایک مفصل اور جامع رپورٹ شائع کی ہے جس میں ملک کی تمام ریاستوں اور مرکزی علاقوں کے اضلاع کے پرائمری اسکولوں کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں اسکولوں کے محل وقوع، گرانٹ، عمارتوں، انتظام، نظام تعلیم، سہولتوں، طلبہ کے داخلوں، ان کی تعلیمی حالت، اساتذہ کی تعداد، لیاقت اور ان کی کارگزاریوں کے بارے میں مفید معلومات جمع کی گئی ہیں اور ان سے کارآمد نتیجے نکالے گئے ہیں تاکہ ہمارا مستقبل کا تعلیمی نظام زیادہ عملی اور مثبت بنایا جا سکے۔ ظاہر ہے یہ کام خاصا دشوار تھا مگر اس میں بڑی مدد ایجوکیشنل مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم (EMIS) سے ملی جو ملک کی تمام ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں رائج ہے۔ ملک کے تعلیمی حالات کے متعلق معلومات سرکاری اور نیم سرکاری دونوں ذرائع کے ذریعے یکجا کی جاتی ہیں، چنانچہ مرکزی اور ریاستی محکمۂ تعلیمات کے ساتھ نیشنل سیمپل آرگنائزیشن، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ، ایجوکیشنل کنسلٹنٹ انڈیا لمیٹڈ اور انڈین مارکیٹ ریسرچ بیورو اس کام میں مصروف ہیں۔ موجودہ رپورٹ کے اعداد و شمار اور معلومات 29 ریاستوں اور مرکزی علاقوں سے متعلق ہیں۔ یہ کام مستقل طور پر تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ چنانچہ امید ہے کہ اگلے جائزے میں ان ریاستوں اور علاقوں کی معلومات بھی حاصل ہو جائیں گی جن سے ابھی تک رابطہ نہیں ہو پایا ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کے جائزوں کی معلومات ہر لحاظ سے مکمل اور مستند نہیں کہی جا سکتیں مگر ان کا معیار کام کرنے اور تجربہ حاصل کرنے کے بعد مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

اس مضمون میں اس رپورٹ کے خاص نکات اور معلومات کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے جو ہماری درس گاہوں، والدین، دانشوروں اور سماجی کارکنوں کے لیے مفید ہوگا۔ ابتدائی تعلیم کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس نسل اور آئندہ نسلوں کے لیے اسے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنانا نہایت ضروری ہے۔ لسانی اور مذہبی اقلیتوں کو بھی اس میں خاص دلچسپی لینی چاہیے۔ مادری زبان سیکھنے، مختلف علوم سے تعارف حاصل کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی نظام نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ذریعے ہم ملک کے طول و عرض میں تعلیمی برتری قائم کر سکتے ہیں اور جہالت اور ناخواندگی کا قلع قمع کر سکتے ہیں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ جس میں کسی بھی مذہب، جماعت، فرقے میں اختلاف نہیں پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس تعلیم کا فائدہ لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی اٹھائیں گی اور اسی کے ذریعے ثانوی، اعلیٰ، پیشہ ورانہ غرض ہر قسم کی تعلیم عام ہوگی، تعلیم کا معیار بلند ہوگا اور سماجی و معاشی فلاح و بہبود حاصل ہو سکے گی۔

ہندوستان کا تعلیمی نظام دنیا کے بڑے تعلیمی نظاموں میں سے ایک ہے۔ اس وقت اس کے دائرۂ کار میں 102 کروڑ 80 لاکھ نفوس کو تعلیم دینا ہے جو ملک کے طول و عرض کے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے سرمایۂ کثیر، پوری قومی توجہ اور سماجی شعور کی ضرورت ہے تاکہ تعلیم سے کوئی بھی محروم نہ رہ سکے۔ ظاہر ہے اس کام کی اصل ذمہ داری مرکزی اور ریاستی سرکاروں کی ہے مگر نجی دائرے میں افراد، اداروں اور جماعتوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اس مشن میں حکومت کی مدد کریں۔

ملک میں ابتدائی تعلیم کی صورت حال کا اندازہ مندرجۂ ذیل نقشے سے لگایا جا سکتا ہے جس میں ہر ریاست اور مرکزی علاقے کے کل اضلاع، اسکولوں، طلبہ اور اساتذہ کی تعداد دی گئی ہے۔

| نام ریاست/مرکزی علاقہ | تعداد اضلاع | اسکولوں کی تعداد | طلبہ کی تعداد | اساتذہ کی تعداد |
|---|---|---|---|---|
| 1. آندھرا پردیش | 23 | 92768 | 11335441 | 466725 |
| 2. اروناچل پردیش | 15 | 2224 | 208732 | 8670 |
| 3. آسام | 23 | 40175 | 4056996 | 155897 |
| 4. بہار | 37 | 53275 | 12853348 | 165309 |
| 5. چنڈی گڑھ | 01 | 179 | 103867 | 4476 |
| 6. چھتیس گڑھ | 16 | 38607 | 3872360 | 104495 |
| 7. دہلی | 09 | 4267 | 2046865 | 64899 |
| 8. گجرات | 25 | 36315 | 6819906 | 190955 |
| 9. ہریانہ | 19 | 13199 | 2181447 | 59905 |
| 10. ہماچل پردیش | 12 | 15676 | 1089609 | 52618 |
| 11. جموں کشمیر | 12 | 15925 | 1351862 | 71181 |
| 12. جھارکھنڈ | 22 | 22199 | 3821676 | 71126 |
| 13. کرناٹک | 27 | 53461 | 7900129 | 227665 |
| 14. کیرالا | 14 | 11684 | 2966380 | 118948 |
| 15. مدھیہ پردیش | 45 | 111727 | 12180832 | 377420 |
| 16. مہاراشٹر | 35 | 76581 | 11636869 | 450785 |
| 17. میگھالیہ | 07 | 8196 | 481356 | 25363 |
| 18. میزورم | 08 | 2346 | 196856 | 12582 |
| 19. ناگالینڈ | 08 | 2356 | 400612 | 18306 |
| 20. اڑیسہ | 30 | 50849 | 5815653 | 158481 |
| 21. پانڈیچری | 04 | 563 | 125339 | 4650 |
| 22. پنجاب | 17 | 21940 | 2683975 | 91484 |
| 23. راجستھان | 32 | 87691 | 9964401 | 296041 |
| 24. سکم | 04 | 1070 | 115289 | 7682 |
| 25. تامل ناڈو | 29 | 50436 | 9784392 | 250214 |
| 26. تریپورہ | 04 | 3456 | 676836 | 30441 |
| 27. اتر پردیش | 70 | 142856 | 27087566 | 400721 |
| 28. اترانچل | 13 | 18628 | 1384944 | 52922 |
| 29. مغربی بنگال | 20 | 59165 | 12870492 | 232311 |
| **میزان** | **581** | **1037813** | **156014030** | **4172272** |

ان اعداد و شمار کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے میدان میں ہمارے ملک نے خاصی پیش رفت کی ہے مگر ابھی بہت کام کرنا ہے اور منزل خاصی دور ہے۔ تعداد کے ساتھ ہی کیفیت یا معیار کی طرف بھی توجہ دینا ضروری ہے۔

رپورٹ میں پرائمری اسکولوں کے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے خاص یہ ہیں۔

پرائمری اسکولوں میں 86.90 فیصد اسکول دیہاتوں میں واقع ہیں۔ رقبے کے اعتبار سے قدرتاً اتر پردیش میں سب سے زیادہ ایک لاکھ بیالیس ہزار آٹھ سو چھپن اسکول ہیں جو کل ملک کے اسکولوں کا 13.77 فیصد ہیں۔ ملک کے آدھے سے زیادہ پرائمری اسکول بلاک ہیڈ کوارٹر سے 10 کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر ہیں۔

ان اسکولوں میں سے 84.85 فیصد اسکول حکومت کے زیر اہتمام چل رہے ہیں۔ ایک لاکھ ستاون ہزار دو سو اڑسٹھ اسکول پرائیویٹ طور پر چل رہے ہیں جن میں 37.73 فیصد کو سرکاری گرانٹ ملتی ہے۔

اتر پردیش میں 1994 کے بعد سے اب تک 34595 نئے پرائمری اسکول کھلے ہیں جو ملک میں سب سے زیادہ ہیں۔

دیہاتوں میں 70.07 فیصد پرائمری اسکول پکی عمارتوں میں چل رہے ہیں جب کہ شہروں میں یہ تناسب 74.30 فیصد ہے۔

پرائمری اسکولوں میں پڑھانے کی جگہ کا اوسط 2.6 کمرہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ 10.90 فیصد پرائمری اسکولوں میں اب بھی الگ الگ درجے نہیں ہیں۔ بہار میں ایک درجہ میں 91 اور یو. پی. میں 65 طلبہ بیٹھتے ہیں۔ ایک لاکھ چوالیس ہزار اسکول ایسے ہیں جو صرف ایک استاد سے کام چلا رہے ہیں۔ 28 فیصد اسکولوں میں بجلی ہے۔ زیادہ تر اسکولوں میں پانی کے نل نہیں لگے ہیں۔ 81 ہزار سے زیادہ اسکولوں میں بلیک بورڈ نہیں ہے۔ 93 ہزار اسکولوں میں کمپیوٹر موجود ہیں۔ مہاراشٹر میں چودہ ہزار اسکولوں میں یہ سہولت میسر ہے جو ملک میں سب سے زیادہ ہے۔ 150 اسکولوں میں کھیلنے کے لیے میدان نہیں ہے۔ اس وقت ملک کے 69.83 فیصد پرائمری اسکولوں کو سرکاری امداد دی جا رہی ہے۔ میگھالیہ، آندھرا پردیش، سکم اور بنگال میں داخلوں کی تعداد سب سے زیادہ پائی گئی اور بہار میں سب سے کم تقریباً چودہ لاکھ معذور بچے ان پرائمری اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ درجہ پنجم تک پہنچنے سے قبل ہی طلبہ کی بڑی تعداد اسکول چھوڑ دیتی ہے۔

ان اسکولوں میں تقریباً چالیس لاکھ سترہ ہزار اساتذہ پڑھا رہے ہیں جو طلبہ کی تعداد دیکھتے ہوئے بہت کم ہیں۔ ایک پرائمری اسکول میں 2.74 استاد کا اوسط پایا جاتا ہے۔ ان میں سے 39.78 فیصد خاتون اساتذہ ہیں۔ کیرالہ، تامل ناڈو، دہلی اور چنڈی گڑھ میں اساتذہ کی اکثریت خواتین پر مشتمل ہے۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار کے مدنظر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس میدان میں ابھی کتنی جدوجہد اور سعی پیہم کی ضرورت ہے۔ اردو سے محبت رکھنے والوں اور مسلم اقلیت کے افراد کا انفرادی اور اجتماعی فرض ہے کہ وہ اس طرف پوری توجہ دیں۔ نئے اسکول قائم کریں، زیادہ سے زیادہ طلبہ کا داخلہ کرائیں اور لائق اساتذہ کی فراہمی میں مدد کریں۔ خاص طور سے اردو کی تعلیم کے لیے اگر اس وقت اس کام میں غفلت برتی گئی تو آگے چل کر بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

□□□

**رابطہ:**

4/873, New Friends Colony
Aligarh (U.P.)

**جدیدیت کی فلسفیانہ اساس**

**مصنف: شمیم حنفی**

پروفیسر شمیم حنفی کی اس کتاب میں جو جدیدیت اور نئے فکری اور فلسفیانہ میلانات کے سیاق میں حوالے کی حیثیت رکھتی ہے، وجودیت اور مارکسیت سمیت ادب، زبان اور آرٹ سے تعلق رکھنے والے تمام اہم مکاتب فکر اور تصورات سے بحث کی گئی ہے۔ ادب میں قدیم و جدید کی کشمکش اور نئے طرز احساس و اظہار کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔

صفحات: 292، قیمت: -/114 روپے

**نئی شعری روایت**

**مصنف: شمیم حنفی**

اردو میں جب جدیدیت کے رجحان نے زور پکڑا اور اس وقت کے نئے لکھنے والوں میں اسے غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی تو اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے موافق اور مخالف دونوں طرح کی آرا کو سامنے رکھ کر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

صفحات، 239، قیمت: -/96 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت. تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا.
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان : شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

جی.ڈی.چندن

# قومی صحافت کا معمارِ اوّل — مولوی محمد باقر

اردو صحافت کی تاریخ میں مولوی محمد باقر ایک ایسا نام ہے جن کے مقام کا اندازہ ان کے اپنے کام کے ساتھ ساتھ ماضی قریب کے حوالے سے بہتر ہوسکتا ہے۔ دراصل یہ مطالعہ ایک واحد شخص کا نہیں بلکہ ایک پورے عہد کا ہے جو قریب قریب ڈیڑھ سو سال پر پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ عہد ہے جس میں قریب 350 سالہ عالی شان مغل سلطنت کا زوال ہوا اور اردو کی پیش رو فارسی کی نوزائیدہ قلمی صحافت کے وقائع نگاروں نے ملک کی آزادی کے غاصب فرنگی تاجروں کے خلاف 1857 کی عوامی بغاوت کی زمین تیار کی۔ پھر ان کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے دہلی کے نامی عالمِ دین اور معلمِ قرآن، مولوی محمد باقر نے مستقبل کی اردو صحافت کو قومی کردار سے سرفراز کیا۔

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

انگلستان نے پہلو بہ پہلو پرتگال، فرانس اور ہالینڈ نے بھی یہاں اپنی تجارتی کمپنیاں قائم کی تھیں لیکن برٹش کمپنی سب سے زیادہ قسمت کی دھنی رہی۔ کمپنی کے اولین گورنر لارڈ کلائیو نے سازشوں اور عہد شکنیوں سے بنگال کے آخری مغل حکمراں نواب سراج الدولہ سے پلاسی کی جنگ جیتی۔ قلمی اخباروں کے گمنام لیکن بالغ نظر وقائع نگار اس منظر کے اولین گواہ تھے جن کے جانشین مولوی محمد باقر نے اردو صحافت کی مشینی طباعت کے نئے وسیلے سے اس نئی علمی صنف کی صورت اور سیرت دونوں کی تعمیر کی۔

انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں نیا معاشرہ جنم لے رہا تھا۔ مغلیہ سلطنت مفلوج ہو چکی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد گھریلو آویزشوں اور باہر کے حریفوں کی جنگوں کا دور دورہ رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نودولتیے موقعے کی تاک میں تھے۔ سلطنت کے سربراہ اب نام ہی کے بادشاہ تھے۔ پھر آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر تک آتے آتے مغل سلطنت کی حدود سمٹ کر لال قلعے کی چہار دیواری تک محدود ہو گئیں۔

ایسے ماحول میں دہلی کے ایک اعلیٰ دینی اور علمی خاندان کا چشم و چراغ سامنے آیا۔ ان کا نام محمد باقر تھا۔ ان کے والد مولانا محمد اکبر دہلی کے نامی گرامی عالمِ دین اور مجتہد تھے۔ ان کے اجداد ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ یہاں پہلے ریاست کشمیر اور پھر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت سلمان فارسی سے ملتا تھا۔

(امداد صابری: تاریخ صحافت اردو، جلد اوّل۔ 202)۔

محمد باقر اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کے والد چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی انھی کی طرح علوم مذہبی کی ترویج سے وابستہ ہو لیکن محمد باقر کی جنھیں ان کے والد نے مروجہ علوم سے خوب خوب بہرہ ور کیا تھا، طبیعت تنوع پسند تھی۔ وہ دلی کالج میں جو مشرقی و مغربی علوم کی تدریس کے لیے 1825 میں شروع ہوا تھا، پہلے طالب علم اور پھر اپنی ذہانت کی بدولت مدرس رہے۔ پھر کلکٹری کے محکمے میں جو اس زمانے میں بڑے اکرام کی بات تھی، تحصیلدار اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدوں پر فائز رہے۔ اس دفتر کے حالات، بالخصوص ہندوستانی ملازموں کے مشاہرے سے وہ بہت ناخوش ہوئے۔ چنانچہ از خود سرکاری ملازمت سے علاحدہ ہو گئے۔

(امداد صابری۔ تاریخ صحافت اردو۔ ص203)۔

انھیں عیسائیوں کے مذہبی پروپیگنڈے اور تبلیغی حوصلوں سے بہت رنج تھا۔ انھوں نے روزمرہ میں اور دلی کالج میں جہاں کے ایک ناظم مسٹر ٹیلر دہلی کے صدر پادری تھے، عیسائیت کی اشاعت کا ماحول دیکھا اور ان حالات کی اصلاح کی طرف راغب ہوئے۔

1834 میں مولوی محمد باقر نے دلی کالج سے اس کا ایک فاضل لیتھو پریس خریدا اور پہلے مطبع اثنا عشری کے نام سے اس میں طباعت کا کام کیا۔ پھر جب نئے اخبار نکالنے کی آزادی ملی تو 1837 میں انھوں نے ''دہلی اخبار'' کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جو اردو کا اولین مطبوعہ اخبار تھا۔ اخبار کے نام میں دو تین بار تبدیلی ہوئی لیکن زیادہ تر اس کا نام ''دہلی اردو اخبار'' رہا۔ مولوی محمد باقر دینی ماحول کے پروردہ اور شیعی عقائد کے پیرو تھے۔ انھوں نے اپنے دینی عقیدوں کے فروغ کے لیے ''مظہر الحق'' کے نام سے ایک الگ اخبار جاری کیا لیکن ''دہلی اردو اخبار'' اس تاریخی شہر کے روایتی معاشرے میں، نئے

موضوعات اور نئے خیالات بالخصوص سیاسی نکات میں دلچسپی لینے والا مخصوص اخبار رہا۔

اس اخبار کا ادبی پہلو بھی دلچسپ اور دلفریب تھا۔ اس میں ذوق، بہادر شاہ ظفر، غالب، حافظ غلام رسول، مرزا محمد علی بخت، مرزا حیدر شکوہ، مرزا جیون بخت اور مرزا انورالدین کے کلام کے علاوہ دہلی کے ادبی گروہوں بالخصوص استاد ذوق اور مرزا غالب کے حلقوں کی نوک جھونک کی خبریں چھپتی رہتی تھیں۔ لیکن اس کا سیاسی پہلو خاص طور پر جاندار اور توانا تھا۔ مولوی محمد باقر انگریزوں کی غلامی کو بہت ناپسند کرتے تھے اور ملک کی آزادی کے شدت سے آرزومند تھے۔

ان کے اخبار میں جیلوں کے دگرگوں حالات، سرکاری حکام اور پولیس کی زیادتیوں، اقتصادی بدحالی، جرائم کے ارتکاب اور عوامی فلاح کی خبریں چھپتی رہیں۔ اداریے کا ان دنوں رواج نہیں تھا لیکن خبروں کی ترتیب و تدوین اس طرح کی جاتی تھی کہ اصلاح کی ضرورت نمایاں ہو۔

مولوی محمد باقر کے احباب میں ہندو، مسلمان اور عیسائی سب تھے۔ ان میں دلی کالج کے معلم اور صحافی ماسٹر رام چندر (مدیر ''فوائد الناظرین''، ''خیر خواہ ہند'' اور ''محب ہند'') قانون داں اور صحافی پربھودیال (ناشر و مدیر، فوائد الشائقین'') اور دلی کالج کے ہیڈ ماسٹر مسٹر جے. ایچ. ٹیلر شامل تھے۔ ان میں دونوں مدیروں کے اخبارات محمد باقر کے مطبع میں بھی چھپتے تھے۔ ماسٹر رام چندر ایک اچھے مفکر تھے اور پربھودیال نئے قوانین کی وضاحت اور افادیت کے مفسر تھے۔

ماسٹر رام چندر نے ''قوم'' کے تصور کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کی ترقی و بلندی کو اپنی صحافت کے بنیادی مقاصد میں شامل کیا۔ ہندوستان کی نئی سیاست کے تناظر میں یہ نظریہ سب سے پہلے ایک اردو مدیر ہی کے قلم سے نکلا۔ 1845 میں اپنے نئے رسالہ ''خیر خواہ ہند'' کے افتتاحی شمارے کے سرورق پر ماسٹر رام چندر نے اسے اپنی صحافت کا ایک بنیادی مقصد قرار دیا۔[1] بغاوت کے بعد اس کے مشتبہین پر کمپنی سرکار کے بھاری جبر و استبداد پر ماسٹر رام چندر نے زبردست احتجاج کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ عیسائیت کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ وہ خود بغاوت سے قبل عیسائیت قبول کر چکے تھے۔

مولوی محمد باقر کی صحافت میں بھی اپنے رفیق عصر کے متذکرہ خیالات کا تاثر واضح تھا۔ 1857 کی بغاوت میں انھوں نے اپنے اخبار کو ایک مجاہد وطن بنا دیا تھا۔ اس کے آغاز کی رپورٹنگ کا اخبار کا 17 مئی 1857 کا شمارہ مولوی محمد باقر کی آنکھوں دیکھی روداد پر مشتمل تھا۔ ''دہلی اردو اخبار'' سے جو واقعات کا عینی شاہد تھا، سامنے آنے والے حقائق مظہر ہیں کہ کمپنی سرکار اس شورش سے اس قدر بوکھلا گئی تھی کہ اس نے ایک مذمتی اور دھمکی آمیز اشتہار چھاپا اور اسے جامع مسجد کے دروازوں اور کئی اور مقامات پر چسپاں کروایا۔ یہ اوائل جون 1857 کی بات ہے جب ہندوستان میں کوئی سیاسی جماعت یا قیادت لوگوں کے کسی گروہ کو ترغیب نہیں دے رہی تھی۔ لوگ خود ہی اپنے وطن کی غیرت کی حفاظت کے لیے میدان میں آ گئے تھے۔ یہ سب لوگ اردو اخباروں کے قارئین یا سامعین تھے اور بہ رضا و رغبت سرفروشی کے لیے آمادہ تھے۔

ان دنوں کوئی باضابطہ خبر رساں ایجنسی موجود نہیں تھی لیکن ہندوستان میں نو رس صحافیوں کے طبقے نے' جو زیادہ تر اردو صحافیوں پر مشتمل تھا، آتے ہی وقائع نگاروں کی طرف رجوع کیا۔ قدیم مغل حکمرانوں کے زمانے میں اطلاعات کی حکومتی ضرورتوں کے لیے فارسی وقائع نگاروں کے جو سلسلے قائم ہوئے تھے ان کے جانشینوں کا ایک طبقہ اب بھی فعال تھا۔ مولوی محمد باقر نے اپنے اثر و رسوخ سے ایسے ذرائع سے رابطہ قائم کیا اور اپنے اخبار میں مختلف درباروں، ریاستوں اور شہروں کی خبریں شائع کیں۔

ماضی قریب میں ان وقائع نگاروں کی بدولت سلطنت کی بالائی سطح پر فارسی میں خبر رسانی کا ایک نظام رائج تھا جو حکمران اور اس کے مقررہ عملے میں بڑی دقیقہ سنجی سے کام کرتا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد جب یہ سلسلہ موقوف ہوا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہوشیار حکام نے اس کے افراد سے اپنا کام لینے کا راستہ نکال لیا۔ انھیں یہاں کی ریاستوں اور درباروں سے اپنے روابط بڑھانے کے لیے مختلف علاقوں کے واقف کار اور فارسی داں عملے کی ضرورت تھی۔ اسی ضرورت کی حد تک انھوں نے انھیں اچھی تنخواہوں پر ملازم رکھ لیا۔ لیکن ان کی زیادہ تعداد آزاد اور حالات کی مشاہد رہی۔ انھوں نے دیکھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض افراد یہاں وہاں پوچھ پاچھ کر رہے تھے۔ انھیں معلوم ہوا کہ جنوبی ہند کرناٹک کے علاقے میں فرانس اور برطانیہ کی تجارتی کمپنیوں کی رقابت سیاسی راہوں پر چل پڑی تھی۔ ان کے پہلو بہ پہلو پرتگال اور ہالینڈ کی کمپنیاں بھی فعال تھیں۔ پرتگالی سب سے پہلے یہاں آئے تھے اور ان کے ایک دلیر ملاح واسکوڈی گاما نے یورپ سے ہندوستان کا نیا راستہ بھی دریافت کیا تھا۔ لیکن برطانیہ کے سوا باقی سب ممالک کی کمپنیاں کچھ عرصے کے بعد جزواً یا کلیتاً واپس اپنے گھر چلی گئی تھیں۔ صرف برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی ہوس کو مزید پھیلاتی رہی۔

(D.N. Kundra : A New Text Book of History of India Part-II, Gur Das Kapur & Sons (P) Ltd. Delhi, Jalandhar, Chandigarh, Kanpur)

ان تجارتی کمپنیوں کی سیاسی رقابت اورنگ زیب کی وفات کے قریب

40 سال بعد زیادہ نمایاں ہوگئی تھی۔ 1717 میں کمپنی کے ایک ڈاکٹر نے اورنگ زیب کے ایک جانشیں فرخ سیر کو ان کی ایک بیماری سے شفا دلا دی تھی۔ اس کے صلے میں فرخ سیر نے کمپنی کو بنگال کی تجارت کا محصول معاف کر دیا تھا۔ یہ بخشش ایسٹ انڈیا کمپنی کے منتظمین تک محدود تھی لیکن جنوبی ہند میں کرناٹک کی تین جنگوں میں فرانس پر فتح پانے کے بعد اس کمپنی نے اپنے تکبر میں اس محدود رعایت کو اپنا اختیار کلی بنا لیا اور کئی نئے تاجروں کو پیشے کے اجازت نامے جاری کر دیے۔ اس سے مغل خزانے کو بہت نقصان پہنچا۔ اسی مرحلے پر جاری یہ کش مکش میں بنگال میں برطانیہ اور فرانس کی تجارتی کمپنیوں نے صوبے کے ماحول کو بگاڑ رکھا تھا۔ چنانچہ بنگال کے حاکم نواب سراج الدولہ نے انھیں جنگ و جدل سے باز رہنے کے لیے کہا۔ فرانس تو مان گیا لیکن برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے انکار کیا اور سیاسی معاملات میں غالباً پہلی بار ہندو مسلم کارڈ کھیلا۔ صوبے کی رعایا میں باہمی بیگانگی استوار کرتے ہوئے ہندوؤں کو مسلم حکومت کے خلاف اکسایا اور بات بات پر نوجوان نواب سراج الدولہ کو پریشان اور زچ کیا۔ طیش میں آکر نواب نے 20 جون 1756 کو انگریزوں کو کلکتے سے بے دخل کر دیا اور اسے واپس اپنے اختیار میں لے لیا۔ اس پر ایسٹ انڈیا کمپنی آپے سے باہر ہوگئی اور مدراس سے اپنے فوجی کپتان لارڈ کلائیو کو بلایا جس نے کرناٹک کی جنگوں میں اپنی چابک دستی سے فرانس کو ہرایا تھا۔ کلائیو نے بنگال پہنچتے ہی اپنی فوجی طاقت سے کلکتہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے نواب نے صلح کر لی اور سب معاملات حسب سابق بحال کرا لیے۔

یہ صلح ایک چھلاوا ہی رہی۔ کمپنی کے گورنر لارڈ کلائیو نے پہلے بنگال میں نواب کی افواج کے سپہ سالار میر جعفر سے ایک ہندو ساہوکار امی چندر کے ذریعہ ساز باز کی اور اسے بنگال کا نواب بنانے کا لالچ دیا۔ میر جعفر کو شیشے میں اتار لینے کے بعد نواب سراج الدولہ پر اس نے الزام لگایا کہ وہ آپسی معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور خفیہ طور پر فرانس سے مل گیا ہے۔ اس الزام کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے بنگال کے علاقے مرشدآباد پر چڑھائی کر دی۔ اس کے فوراً بعد کلکتے سے 20 میل دور پلاسی میں دونوں کی جنگ ہوئی۔ عین میدان میں سپہ سالار میر جعفر اپنی افواج کو کوئی حکم دیے بغیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اپنے فوجی سردار کی یہ روش دیکھ کر سراج الدولہ نے روپوش ہونے کی کوشش کی لیکن پکڑا گیا اور میر جعفر کے بیٹے میران نے اسے قتل کر دیا۔ یوں میر جعفر کی غداری سے تاجر انگریز ہندوستان کے مشرق کے پھاٹک بنگال کا صاحب اختیار ہوگیا۔

قیاس اغلب ہے کہ اس امر کا علم ہوتے ہی آزاد وقائع نگاروں کے ایک دلیر حصے نے نجی اخبار نویسی اختیار کی اور شمالی ہند میں مطبوعہ صحافت کی آمد سے قریب چار دہائی قبل آزادیِ وطن کے لیے وقف نجی قلمی صحافت کا آغاز ہو گیا، گو اس سے قبل ہی اس صحافت کے وقائع نگار اپنے شاہ کو کونے کونے سے خلاف ملک سرگرمیوں کے بارے میں مطلع کر رہے تھے۔ ان کے مراسلات کو ''اخبار'' ہی کہا جاتا تھا۔ ہندوستان میں یہ دستور باقی دنیا میں کسی بھی زبان میں مطبوعہ صحافت کے آغاز سے قبل ہی موجود تھا۔

نجی قلمی صحافت کے وقائع نگار اپنے ''اخبار'' کے جو اکثر و بیشتر یک ورقی اور دو ورقی تھے، خود ہی ناشر، رپورٹر، ایڈیٹر، نقیب سب کچھ ہوتے تھے اور اپنے اشاعتی امور کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ راقم السطور کو اس قلمی صحافت کی کوئی باضابطہ تاریخ نہیں مل سکی لیکن ہندوستان میں برٹش حکومت کے کئی سربراہوں کی رپورٹوں اور دیگر تحریروں میں ان اخباروں کا ذکر بار بار ملتا ہے جہاں انھیں جذبۂ آزادی کے تیز مزاج کہا گیا ہے۔ مثلاً گورنر جنرل کی کونسل کے رکن قانون لارڈ ٹی. بی. میکالے نے ان کی صحافت پر اپنے ایک نوٹ میں لکھا:

''یہ اخبار مرتب کرنے والوں کی تعداد کثیر ہے جو ہر کچہری اور دیسی راجوں کے درباروں کے ارد گرد خبروں کی تلاش میں متواتر گھومتے رہتے ہیں۔ دہلی کے (شاہی) محل اور ریزیڈنسی کے مقامات پر بیس تا تیس وقائع نگار موجود رہتے ہیں۔ مقامی باشندوں کے بہت سارے امیروں میں ہر وقائع نگار کے خریدار ہیں جنھیں یہ وقائع نگار ہر روز کچہری اور شہر کی تمام گرم خبریں اور افواہیں مہیا کرتے ہیں۔ دہلی سے ہر روز جو قلمی اخبار باہر بھیجے جاتے ہیں، ان کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم نہیں ہو سکتی لیکن جانکار لوگوں کا اندازہ ہے کہ یہ 120 ہے۔ یہ اخبار چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل سے اٹے ہوتے ہیں ... اکثر ان میں حکومت اور اس کے ملازمین کو رسوا کیا جاتا ہے اور ہمارے (برطانوی) کردار اور اطوار پر پھبتیاں اڑائی جاتی ہیں۔''

(Cited by Dr. Abdul Salam Khursheed : Newsletters in the Ortrant, 1956. P.86,87)

لارڈ میکالے کی نیش زنی سے قطع نظر یہ حقیقت آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے کہ نجی قلمی اخبار وقت کی خبروں سے لبریز ہوتے تھے اور انھیں امرا اور رؤسا کی مالی سرپرستی حاصل تھی اور یہ طبقہ فرنگی سرکار کے وظیفہ خوار وقائع نگاروں سے حیثیت اور وقعت میں کم نہیں تھا۔ مزید یہ اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے حلقۂ اشراف میں فرنگی حکومت کے کردار و اطوار سے وسیع بے اطمینانی تھی جس کا اظہار مولوی محمد باقر کے مطبوعہ اخبار اور 1857 کی بغاوت میں واضح طور پر ہوا۔

اس سے قبل کمپنی کے ایک اور ایگزیکٹیو سرجان میلکم نے 1833 میں لکھا تھا:

"یہ اشتعال انگیز اخبار نکل رہے ہیں جن کے ذریعے بے چینی اور بغاوت کے جذبات کو اکسایا جا رہا ہے۔"

(ایضاً۔ص۔85)

اس تحریر سے قریب ربع صدی بعد متوقع بغاوت پھوٹ پڑی جس میں مولوی محمد باقر نے اپنی صحافت اور جان عزیز دونوں کی قربانی دی۔

متذکرہ تبصروں سے برطانوی مورخین کے اس مفروضے کی تردید ہو جاتی ہے کہ 1857 کی عوامی بغاوت ایک "غدر" تھا جو چند گمراہ سپاہیوں کی بے ادبی کا شاخسانہ تھا۔

ماضی میں یہ وقائع نگار حکمراں کے شعبۂ سراغ رساں کے مخبر تھے۔ اپنی آجر بادشاہت کے تنزل کے بعد یہ اپنی صوابدید سے عوام کے مخبر ہو گئے۔ ان جہاں دیدہ رپورٹروں کو برطانوی سیاست میں قدم قدم پر شاطری اور عوام کی بے کسی نظر آئی۔ ملکی مفاد کو زک پہنچانے والوں سے انھیں کوفت ہوتی تھی اور یہ فرنگی راج کے اخراج کے طالب تھے۔ اس کا ثبوت پچھلے صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ "اشتعال انگیز" اخبار صرف شمالی ہند یا دہلی ہی نہیں بلکہ جنوبی ہند میں بھی نکل رہے تھے۔ معاملات کمپنی کے ایک نامور مبصر ایس۔سی۔ سانیال کے ایک مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ہند میں مناداپریا نام کے ایک دلاور نے 1800 میں اپنے علاقے کے تقریباً ہر گاؤں میں اپنا آزادی پسند قلمی اخبار بانٹا جس میں علاقے کے باشندوں سے یہ اپیل کی گئی کہ:

"وہ یورپ کے ان نیچ لوگوں کے خلاف متحد ہو جائیں جنھوں نے ہمارے ملک کی آزادی پر چھاپہ مارا ہے۔" اس اپیل میں "برہمنوں، کشتریوں، مسلمانوں اور دیگر فرقوں اور پیشوں کے لوگوں" کو مخاطب کیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ:

"وہ دلیری سے کام لیتے ہوئے ان ذلیل اور بے شرم لوگوں (فرنگیوں) کا خاتمہ کر دیں اور جب تک یہ ختم نہ ہوں، اپنا عمل (جہاد) جاری رکھیں۔" اس قلمی اپیل کے قریب 57 سال بعد جنوبی ہند سے ہزاروں میل دور دہلی کے مولوی محمد باقر نے اپنے "دہلی اردو اخبار" میں ایسی ہی اپیل شائع کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے کہا کہ وہ بہادری کی اپنی قدیم روایات سے کام لیتے ہوئے اب اس جنگ میں انگریزوں کا خاتمہ کر دیں۔

ہماری قلمی اور مطبوعہ صحافت کی اس مطابقت پر غالباً ابھی تک کوئی جامع تاریخ مرتب نہیں ہوئی لیکن "دہلی اردو اخبار" کی بیس سال کی عمر کے بہت سارے شمارے اس موضوع کے ترجمان ہیں۔ اس کے بانی ایڈیٹر مولوی محمد باقر نے گمنام طور پر اس کے کالم رقم کیے۔ وہ صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ وطن کی حریت کے بھی مجاہد تھے۔ حریت کے لیے انھوں نے مختلف فرقوں کے اتحاد کو اپنے مسلک کا جزو لاینفک تصور کیا۔ 1857 کی بغاوت جس کی کاشت میں ان کے اخبار نے ہراول دستے کا کام کیا، جب اچھی پیش رفت کر چکی تھی تو جون 1857 میں انھوں نے لکھا:

"اے سپاہ دلیران تلنگاں، بیشتر تاریخوں میں جس طرح سے کہ سلطنت ہائے سابقہ میں کارنامہ ہائے شجاعان زمانِ گذشتہ یادگار ہیں کہ تاریخ قدیمۂ ہند میں خاندان یدونشی میں بھیم و ارجن وغیرہ بہادری میں یادگار ہیں اور علیٰ ہذالقیاس تواریخ فارسی میں شجاعتِ رستم و سام اور سلطنت اہل اسلام میں فتوحات حضرت صاحب قراں امیر تیمور گاں اور دلیران فوج چنگیز خاں و بہادران ہلاکو خاں و افواج نادر یہ تواریخوں میں لکھتے چلے آئے ہیں اور آخر زمانے کے لوگوں کی ہمت کو بڑھاتے ہیں اور جرأت کو ترقی دیتے ہیں اسی طرح یہ معرکہ تمھارا بھی تواریخوں میں لکھا جائے گا اور صفحۂ عالم پر کار رستمانہ تمھارا یاد رہے گا کہ اس بہادری اور جوانمردی سے تم نے ایسے اولوالعزم اور متکبر سلطنت کے کبر و غرور کو توڑا ہے اور ان کی نخوت و فرعونی اور غرور شدادی کو یکسر خاک میں ملا دیا ہے۔"

جب یہ بغاوت 10 مئی کو کھلم کھلا شروع ہوئی تو مولوی محمد باقر نے اپنی ذات اور اپنے اخبار دونوں کو اس کے لیے وقف کر دیا۔ اخبار کا 17 مئی کا پورا شمارہ انھوں نے بغاوت نمبر کی شکل میں شائع کیا۔ اس میں دہلی شہر، دہلی چھاؤنی، انبالہ، میرٹھ، سہارن پور اور روڑکی کے حالات احتجاج بیان کیے گئے۔ مولوی محمد باقر نے حسب معمول رپورٹر کا کام پردے میں کیا اور "راقم آثم" کے نام سے ایک طویل روداد شائع کی جو اس عظیم جنگ آزادی کی چشم دید رپورٹ کی تاریخی یادگار ہے۔ اس کے مطالعے کے بغیر آزادی کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ بغاوت کے چشم دید واقعات رقم کرنے کے علاوہ مولوی محمد باقر محبان وطن کی ہمت بڑھانے کے لیے قومی اپیلیں، نصیحتیں، پیروں اور بزرگوں کے برکاتی خواب اور شرعی اقوال بھی شائع کرتے تھے۔ 24 مئی 1857 کے شمارے میں ان کے صاحب علم و ادب فرزند مولوی محمد حسین آزاد کی نظم "تاریخ انقلاب عبرت افزا" بھی شائع ہوئی جس کے چند اشعار حسب ذیل تھے:

ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ اک چشم زدن میں
ہاں دیدۂ دل کھول دے اے صاحب ابصار
ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ
تھی صاحب اقبال و جہاں بخش و جہاں دار

تھی صاحب علم و ہنر و حکمت و فطرت
تھی صاحب جاہ و حشم و لشکر جرار
اللہ ہی اللہ ہے جس وقت کہ نکلے
آفاق میں تیغ غضب حضرت قہار
سب جوہر عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے
سب ناخن تدبیر و خرد ہو گئے بیکار
کام آیا نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت
پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو ہیں مار
یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا
ہے گردش گردوں بھی عجب گردشِ دوار
نیرنگ پہ غور اس کے جو کیجے تو عیاں ہے
ہر شعبدۂ تازہ میں صدبازیِ عیار
ہاں دیدۂ عبرت کو ذرا کھول تو غافل
ہیں بند یہاں اہل زباں کے لب گفتار
عبرت کے لیے خلق میں یہ سانحہ بس ہے
گر دیوے خدا عقلِ سلیم و دلِ ہشیار

(بحوالہ محمد عتیق صدیقی۔ ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) ص۔383

والد کی طرح بیٹے نے بھی بغاوت کے آغاز اور باغیوں کی فوری کامیابی کا منظر بچشم خود دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے مشاہدے اور احساس کی قوت بڑی عمدگی سے نظم میں اتر آئی۔

مولوی محمد باقر اور ان کے ارباب کا خیال تھا کہ بغاوت کے اسباب خود کمپنی ہی نے پیدا کیے۔ فوجی سپاہ کے کارتوسوں پر سور اور گائے کی چربی کا تو ایک بہانہ تھا کمپنی کا فعل و عمل تجارت کے دائرے سے بار بار باہر نکل جاتا تھا۔ کبھی مغل حکمرانوں کی مروت کا استحصال، کبھی اپنی ترنگوں کے لیے مقامی صوبیداروں پر دباؤ، کبھی سرکاری نوکری کے لیے انگریزی خوانی یا بائبل خوانی کا لزوم جس سے معاش کے کئی ضرورت مندوں کو اپنے مذہب کے خلاف جانا پڑتا تھا، ایسی علتیں تھیں جن سے کمپنی دن بدن بدنام ہوتی رہی۔

1757 کی ایک صوبائی جنگ میں اپنی سازشی جیت کے بعد یہ بزعم خود سارے ہندوستان کی حاکم بن گئی تھی اور ملک کے کمزور علاقوں کو اپنی ہوس کا مرکز بنا رہی تھی۔ یہ کیفیت کمپنی کے اس اشتہار میں کھل کر نمایاں ہوگئی جو اس نے محمد حسین آزاد کی متذکرہ نظم کی اشاعت کے دو ہی ہفتے بعد دلی کی جامع مسجد کے دروازوں اور دیگر منتخبہ مقامات پر بڑے اہتمام سے چسپاں کروایا۔ اس کا مقصد رعب اور دھمکیوں سے بغاوت کا انسداد کرنا تھا۔ اس میں برملا یہ اعتراف کیا گیا کہ فوج کو جو کارتوس مہیا کیے گئے ان پر چربی تو ضرور تھی لیکن وہ صرف گائے کی تھی۔ لہٰذا مسلمانوں کا بغاوت میں شامل ہونا غلط ہے۔ پھر اس سرکاری اشتہار میں ایک اور پھوہڑپن یہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو سمجھایا گیا کہ خوک خوری نہ تو گناہ کبیرہ ہے نہ اس سے کوئی اسلام سے خارج ہوتا ہے۔

سارا پوسٹر اسی طرح اشتعال انگیز تھا جس کی ہر دلیل میں کوئی نہ کوئی نزاعی پہلو اختیار کیا گیا تھا۔

مولوی محمد باقر اس کے مضمون اور منطق دونوں کو برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کمپنی نے اپنی صفائی میں جلتی پر تیل ڈالا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً اشتہار کے مضمون کو شق بہ شق لیتے ہوئے اپنا دنداں شکن جواب اپنے اخبار میں چھاپ دیا۔ اس میں انھوں نے چند ایسے انکشافات بھی کیے جن سے کمپنی کی رہی سہی عزت بھی مٹی میں مل گئی۔ مثلاً سپاہ کے کارتوسوں پر چربی کی حقیقت جانتے ہوئے بھی کمپنی نے دوران بغاوت ہر روز شہر پر گولہ باری کی جس سے لامحالہ انگنت معصوم لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے۔ مزید ملک کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے مہمانوں کی آمد و رفت، شخصی نقل و حرکت اور راہ و رسم کے بنیادی انسانی حقوق چھین لیے گئے تھے اور انھیں قلعے کی چار دیواری میں طرح طرح کی پابندیوں میں باندھ دیا گیا تھا۔

کمپنی حکومت نے اپنے اشتہار میں کارتوسوں کی چربی کو صرف گائے تک محدود کرنے کی منطق سے مسلمانوں کی خوش نودی کی کوشش کی تھی لیکن مولوی محمد باقر نے جھوٹ کی اس تدبیر کے بخیے ادھیڑتے ہوئے کہا: ”کوئی پوچھے کہ کیا اس سے دین ہندو کا نہیں بگڑتا، اب ان کی (انگریز) کس بات کا اعتبار کیا جاوے...... بہرکیف سپاہ اسلام عین عافیت اندیشی کے سمجھ گئے کہ آج یہ ظلم ہنود پر ہے، کل ہم پر ہے۔“

(امداد صابری۔ تاریخ صحافت اردو، جلد اوّل۔ ص۔ 186)

پورے چار ماہ کی تمازت اور تمکنت کے بعد 1857 کی بغاوت بالادست فرنگی کی حکمت و عیاری، دیسی ریاستوں کی حربی کمزوری اور اندرونی نزاع کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔ اس کے فوراً بعد انگریزوں نے بغاوت کے مجاہدوں، حامیوں اور دیگر مشتبہ لوگوں کی اندھا دھند گرفتاری اور گولیوں سے ہلاکت شروع کر دی۔

مولوی محمد باقر کی شہادت کے بارے میں کئی روایتیں مشہور ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ باغیوں کو دلی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر کے، جو عیسائیت کا زبردست مبلغ تھا، قتل کو ترغیب دینے کے شبہ میں فرنگی حکام نے گولی مار دی۔

ایک اور خاندانی روایت، جو محمد حسین آزاد کے نبیرہ آغا محمد باقر نے بیان کی، یہ ہے کہ وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کے ایام میں انگریز حاکموں نے 16 ستمبر 1857 کو مولوی محمد باقر کو بھی گرفتار کر لیا تھا اور 16 ستمبر کو انھیں کیپٹن ہڈسن کے سامنے پیش کیا۔ ان کے حکم سے انھیں اسی دن دہلی دروازے کے باہر خونی دروازے کے سامنے کے میدان میں گولی سے شہید کر دیا گیا۔ جس دن انھیں دیگر عمائدین شہر کے ساتھ گولی ماری جانے والی تھی، ان کے فرزند محمد حسین آزاد اپنے والد کے ایک دوست کرنل سردار سکندر سنگھ کی مدد سے بھیس بدل کر اور ان کا سائیس بن کر دہلی دروازے کے باہر کے میدان کے کنارے سے باپ کے آخری دیدار کے لیے گئے۔ وہاں چاروں طرف فوجی پہرا تھا۔ مولوی محمد باقر نماز پڑھ رہے تھے۔ آزاد گھوڑے کی باگ تھامے فاصلے پر کھڑے تھے اور منتظر تھے کہ کب آنکھیں چار ہوں۔ مولوی صاحب نے نماز ختم کر کے نظر اٹھائی تو سامنے اپنے پیارے بیٹے کو دیکھا، دونوں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مولوی محمد باقر نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور ساتھ ہی اشارہ کیا کہ بس آخری ملاقات ہو چکی۔ اب رخصت۔ محمد حسین آزاد خود بھی مشتبہ افراد کی فہرست میں تھے، ان کے والد کا اشارہ پاتے ہی کرنل سکندر سنگھ نے اپنا گھوڑا موڑ لیا اور دونوں وہاں سے واپس چلے آئے۔

(امداد صابری۔ تاریخ صحافت اردو، جلد اول ص۔ 219)

شہادت کا وقت ہو گیا تھا، فرنگی کپتان نے توپ کا گھوڑا دبایا اور 77 سالہ مولوی محمد باقر حق تعالیٰ سے جا ملے۔

آزادی کے جاں نثاروں نے اپنی جانیں جاں آفریں کے سپرد کر دیں لیکن حصول آزادی کا ولولہ قدم بہ قدم آگے بڑھتا رہا۔ قریب نصف صدی بعد دہلی کے پڑوسی صوبہ متحدہ سے مولانا فضل الحسن حسرت موہانی نے پھر جہاد آزادی کا چراغ روشن کیا۔ اس کے فیضان سے نصف صدی سے بھی کم عرصے میں ملک کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا اور فرنگی جس کی سلطنت کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا، دوستی اور رفاقت مانگتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ اس رخصتی کے پیچھے مولوی محمد باقر اور ان کے ہمنواؤں کی شہادت کی لو رقصاں ہے۔

□□□

رابطہ:

G-46, Ground Floor
Jangpura Extension
New Delhi-110014.

## دل کی گیتا

**مدوّن: مخمور سعیدی**

"شریمد بھگوت گیتا" ہندستان کا وہ الہامی صحیفہ ہے جس کے ترجمے دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے ہیں۔ اردو میں بھی اس کے تراجم ہوتے رہے ہیں لیکن خواجہ دل محمد کا یہ ترجمہ گیتا کا بہترین ترجمہ ہے جو اردو نظم میں کیا گیا ہے۔ ترجمے میں بہت سے مقامات پر کثیر المعانی الفاظ آئے ہیں، خواجہ صاحب نے ایسے تمام مقامات پر حاشیے میں وہ معنی درج کر دیے ہیں جو وہاں مطلوب ہیں۔ جہاں جہاں ضروری سمجھا ہے حواشی میں مطالب کی تفسیر و توضیح بھی کرتے گئے ہیں۔

صفحات: 240، قیمت: -/92 روپے

## خواجہ میر درد

**مصنف: ظہیر احمد صدیقی**

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالات زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

اقبال محی الدین

# دیہی و زرعی کہاوتیں، سائنس کی کسوٹی پر

کھیتی اور موسم سے متعلق دیہی و زرعی کہاوتیں سائنس کی کسوٹی پر آج بھی اتنی ہی صحیح ہیں جتنی پانچ سو سال پہلے تھیں۔ ان میں ہندوستانی کسانوں کے صدیوں کے تجربات کا نچوڑ موجود ہے جو نسل در نسل اور سینہ بہ سینہ ہوتی ہوئی آج ہم تک پہنچی ہیں۔ یہ کہاوتیں پانچ سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہیں جن کو پندرہویں اور سولہویں صدی کے شعرا نے اشعار کی لڑیوں میں گوندھ کر ہم تک پہنچایا ہے۔ یہ واقعی قابلِ تعریف ہیں۔ ان مشہور شعرا کے نام ہیں گھاگھ، بھڈر اور رحیم وغیرہ۔

ہندوستان کی 80 فیصد سے بھی زیادہ آبادی گاؤں میں رہتی ہے اور وہ کھیتی باڑی پر منحصر ہے۔ ہندوستان کی کھیتی زیادہ تر مانسون بارش پر منحصر ہے اس لیے یہاں کے کسان اپنے تجربات کی بنا پر ہواؤں کے رخ اور بادل کی مختلف شکلوں کو دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ بارش کب اور کتنی ہوگی یا نہیں ہوگی۔ گاؤں کی ان زرعی کہاوتوں میں کسانوں کا کتنا تجربہ ہے اور سائنس کی کسوٹی پر کتنی پوری اترتی ہیں، اس بات کا تجزیہ ضروری ہے۔

گریا بادر جیو ڈروائے
بھورے بادر پانی لائے

(کالے بادل تو صرف دل دہلاتے ہیں مگر بارش بھورے رنگ کے بادلوں سے خوب ہوتی ہے۔)

سائنسی اعتبار سے یہ زرعی کہاوت بالکل صحیح ہے کیونکہ نمبس (Nimbus) نام کے بادلوں سے خوب بارش ہوتی ہے جو بھورے رنگ کے ہوتے ہیں۔ کالے رنگ کے بادل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جھوم کے گھٹا اٹھے گی اور ٹوٹ کے پانی برسے گا مگر دراصل یہ بادل صرف دل کو دہلاتے ہیں، تھوڑی بہت بارش بھی ہو جاتی ہے مگر دراصل جب بھورے رنگ کے نمبس بادل آسمان میں چھتے ہیں تو موسلادھار بارش ہوتی ہے۔ اس کہاوت کے سائنسی پہلو کو سمجھنے کے لیے بادلوں کی قسمیں، ان کے رنگ اور اشکال اور ان کی زمین سے اونچائی کا جاننا بہت ضروری ہے۔

زمین سے دس ہزار فٹ کی اونچائی تک پائے جانے والے چار طرح کے بادل ہوتے ہیں۔ (1) اسٹیرٹوکیومولس (Stratocumulus): یہ لڑھکتے ہوئے بادل ہوتے ہیں (2) نمبس (Nimbus): یہ بارش کے بادل ہوتے ہیں جن کا رنگ بھورا ہوتا ہے۔ (3) کیومولس (Cumulus): یہ نیچے سے چپٹے اور گول چوٹی کے بادل ہوتے ہیں۔ (4) اسٹرٹس (Stratus): یہ کہر سے جیسے بادل ہوتے ہیں جو زمین کے نزدیک ہوتے ہیں۔

زمین سے دس ہزار فٹ سے 20 ہزار فٹ تک پائے جانے والے بادلوں کو درمیانی بادل کہا جاتا ہے۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ (1) آلٹواسٹیرٹس (Altostratus): یہ پانی جیسی شکل کے بادل ہوتے ہیں اور (2) آلٹوکیومولس (Altocumulus): یہ گول شکل کے بادل ہوتے ہیں۔

زمین کے اوپر 20 ہزار فٹ اور 40 ہزار فٹ تک پائے جانے والے بادل پانچ طرح کے ہوتے ہیں۔ (1) سیرس (Cirrus): یہ گچھے دار بادل ہوتے ہیں (2) سیروکیومولس (Cirrocumulus): یہ لہردار بادل ہوتے ہیں۔ (3) سیرواسٹیرٹس (Cirrostratus): یہ پتلی چادر جیسے بادل ہوتے ہیں۔ (4) کیومولونمبس (Cumulonimbus): یہ طوفانی بادل ہوتے ہیں اور بہت اونچائی تک اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ (5) ارڈی ڈیسینٹ (Irridiscent): یہ بادل 40 ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر کے بادل ہیں جن کا رنگ قوس قزح سے ملتا جلتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نمبس (Nimbus) نام کے بھورے بادلوں سے خوب بارش ہوتی ہے اور دوسرے بادلوں سے برائے نام بارش ہوتی ہے۔ گاؤں کی یہ زرعی کہاوت:

کریا بادر جیو ڈروائے
بھورے بادر پانی لائے

سائنس کی کسوٹی پر آج بھی پوری اترتی ہے جتنی پانچ سو سال پہلے صحیح تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس سائنسی دور میں جب کہ مصنوعی سیاروں کے ذریعے موسم کی پہلے سے معلومات حاصل ہو جاتی ہیں، کسانوں کے اپنے ذاتی تجربے نے آج کی سائنسی کھیتی میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ صدیوں کی دانائیاں سائنس کی شکل میں ان کہاوتوں میں بھری ہوئی ہیں جن کو ہمارے کسان بھائی آج بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ صحیح وقت پر سینچائی، کھیت کی نرائی، کھاد اور بیج کی مقدار کی معلومات، بیلوں کی اچھی قسمیں اور پودوں کو بیماریوں سے بچانے کے طریقے نے آج کی کھیتی کو اپنے عروج پر پہنچا دیا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہو سکا جب کسانوں نے اپنے تجربے کا فائدہ اٹھایا اور سائنسی ایجادات کی مدد لی۔ عمدہ قسم کے بیج اور کیمیائی کھاد کا استعمال کرنے سے کھیتی کئی گنا بہتر ہو گئی۔

ہندوستان میں کھیتی باڑی کی معاشی اہمیت بہت ہے۔ زراعت ہی ایسی صنعت ہے جو ہندوستان کی زیادہ تر آبادی کو روزی روٹی دیتی ہے۔ کھیتی پر منحصر

بہت سے کسان ان پرانی زرعی کہاوتوں کو یا تو بھولتے جا رہے ہیں یا جانتے ہی نہیں۔ ان کو پھر سے ان کہاوتوں کو یاد دلانا بہت ضروری ہے۔ اگر وہ زرعی کہاوتوں کے مختلف پہلوؤں یعنی موسم کا پہلے سے علم، سینچائی، نرائی، پودوں کی بیماریوں، بیج کی مقدار، بیلوں کی نسلیں اور ان کی طاقت، کھاد، ملی جلی کھیتی، فصل کا چکر، فصلوں کی کٹائی اور نقدی فصلوں وغیرہ کو دھیان میں رکھ کر کھیتی کریں گے تو یقیناً ان کو بے حد فائدہ پہنچے گا۔ اب ہم ان زرعی اور دیہی کہاوتوں کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

**موسم سے متعلق کہاوتیں:**

موسم سے متعلق ہمارے کسان بھائی اپنے روزمرہ کے تجربے کی بنا پر بتا سکتے ہیں کہ بارش ہونے کے پہلے کیا کیا آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں دیہی اور زرعی کہاوت کے مطابق:

گلسا پانی گرم ہوئے، چڑیاں نہاویں دھور
انڈا لے چیونٹی چلے تو برکھا بھرپور

(گھڑے کا پانی خود بخود گرم ہو جائے اور چڑیاں مٹی میں لوٹنے لگیں تو یہ علامت بارش کی ہے۔ بارش کے دوران چیونٹیوں کو کھانا اکٹھا کرنے میں دقت ہوگی اس لیے وہ برسات سے پہلے ہی اپنا کھانا جمع کر لیتی ہیں۔)

گرو شکر کی بادری رہے سنیچر چھائے
کہیں گھاگھ سن گھاگھنی بن برسے نہ جائے

(اگر دو تین روز تک لگاتار بادل چھائے رہیں تو بارش یقینی طور پر ہوگی۔ گھاگھ اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ سنو۔ اگر بادل جمعرات، جمعہ اور سنیچر تک مستقل چھائے رہیں تو یہ بغیر برسے نہیں ہٹیں گے۔)

اس کہاوت میں کسان بھائیوں کا تجربہ ہے جو مشاہدہ کرتے ہیں کہ بادل کی مستقل جماوٹ بارش ضرور لاتی ہے۔

اُتر چمکے بجوری، پُروا بہو باؤ
گھاگھ کہیں بھڈر سے بردھا بھیتر لاؤ

(شمال کی سمت میں بجلی چمکے اور مشرقی ہوائیں چلتی رہیں تو بارش ضرور ہوگی۔ گھاگھ شاعر اپنے دوستوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ایسی صورت میں بیلوں اور دوسرے جانوروں کو کھلے میں نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ اندر لاکر باندھنا چاہیے کیونکہ باہر رہ کر وہ بھیگ کر بیمار پڑ سکتے ہیں۔)

ساون پچھوا، بھادوں پُروا، آسن بہے ایسان
کاتک کنتا سینک نہ ڈولے، گانجیں سب کسان

(ساون کے مہینے میں مغربی ہوائیں چلیں اور بھادوں میں مشرقی ہوائیں چلیں اور شمال مشرق میں بھی ہوا چلتی رہے تو بارش یقیناً ہوگی مگر کاتک کے مہینے میں بارش نہ ہو تو فصل بہت عمدہ ہوگی اور کسانوں کے گھر اناج سے بھر جائیں گے۔)

دن کے بدّر، رات نِی بدّر
پُروا بہے جھمّر جھمّر
گھاگھ کہیں کچھ ہونی ہوئی
کنواں کا پانی دھوبی دھوئی

(اگر دن میں بادل چھائے رہیں اور رات میں یہی بادل چھٹ جائیں اور مشرقی ہوائیں بھی چلتی رہیں تب بھی بارش نہیں ہوگی اور پانی کا ایسا قحط پڑے گا کہ دھوبی کو بھی کپڑا دھونے کے لیے پانی نہیں ملے گا۔ مجبوراً اسے کنویں کے پانی سے کپڑا دھونا پڑے گا۔)

بھینس جو جنمے پڑوا، بہو جو جنمے دِھی
سمے کلچھمن جانیے، کاتِک برسے نی

(جس طرح بھینس کا نر بچہ کسان کے لیے زیادہ مفید نہیں ہوتا اور غریب کسان کی بہو اگر لڑکی کو جنم دے تو وہ اس کو اپنے لیے ایک بوجھ سمجھتا ہے (حالانکہ اب یہ غلط تصور ختم ہو چکا ہے اور لڑکے اور لڑکیاں دونوں برابر مانے جاتے ہیں)۔ اسی طرح اگر ربیع فصل بوتے ہی نومبر کے مہینے میں بارش ہوتی رہے تو اس سے بویا ہوا بیج خراب ہو جائے گا اور کسان پر بڑی تباہی آ جائے گی۔)

پُروا سے پچھوا چلے، رانڈ مہرارو کا جر کرے
بھڈر کے من یہی وِچار، اِی برِی او کری بھتار

(اگر مشرقی ہوائیں مغربی ہواؤں میں تبدیل ہو جائیں اور بیوہ عورت سنگار پٹار کرنا شروع کر دے تو بھڈر شاعر کے دل میں یہی بات آتی ہے کہ وہ ہوائیں بارش لائیں گی اور یہ عورت اپنا دوسرا بیاہ رچائے گی۔ مطلب یہ کہ یہ دونوں باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں کہ ان ہواؤں سے بارش ضرور ہوگی اور بیوہ عورت کے اندر جو تبدیلی ہو رہی ہے اور وہ بننے سنورنے لگی ہے تو یہ صاف علامت ہے کہ وہ دوسرا شوہر کر لے گی۔)

اَتی کا بھلا نہ برسنا، اَتی کی بھلی نہ دھوپ
اَتی کا بھلا نہ بولنا، اَتی کی بھلی نہ چوپ

(بارش اور دھوپ دونوں کی زیادتی کھیتی کے لیے نقصان دہ ہے۔ اسی طرح زیادہ بولنا یا بالکل خاموش رہنا بھی برا سمجھا جاتا ہے۔)

کانٹا بُرا کریل کا، او بدلی کا گھام
سوتن بری ہے چون کی، او ساجھے کا کام

(کریل ایک کانٹے دار جھاڑی ہے جس کا کانٹا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے کیونکہ وہ جھاڑ جھنکاڑ کی طرح چپٹ جاتا ہے۔ اسی طرح بدلی کی دھوپ بھی بہت سخت اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اس کی گرمی اور گھٹن سے پسینہ بہت ہوتا ہے جس سے آدمی پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر عورت کی سوت خواہ وہ آٹے کی ہی کیوں نہ بنا کر رکھ دی جائے، اسے بھی عورت برداشت نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ساجھے کا کام بھی برا ہوتا ہے کیونکہ کچھ ہی دنوں میں غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی ہو

جاتی ہے اور ساجھے کی ہانڈی بیچ بازار میں ٹوٹتی ہے۔)

چمکے پچھم اتر اور
تب جانو پانی ہے زور

(شمال مغرب کی سمت میں بجلی چمکتی رہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ پانی خوب برسے گا۔ جب جنوب مغربی مانسون ہوائیں گرمیوں میں چلتی ہیں تو وہ خلیج بنگال سے گزرتی ہیں اور خوب نم آلود ہو جاتی ہیں۔ ان سے شمالی ہندوستان میں خوب بارش ہوتی ہے۔ کسانوں کے برسہا برس کے تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بارش سے پہلے شمال مغرب کی جانب بجلی چمکتی ہے اور خوب بارش ہوتی ہے۔)

مور پنکھ بادر اٹھے، رانا کاجر ریکھ
یہ برسی وہ گھر کری، یا ماں مین نہ میکھ

(مور کے پنکھ کی طرح گھٹا اٹھے اور بیوہ عورت سنگار پٹار کرنا شروع کر دے تو دونوں اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ یہ گھٹا تو ضرور برسے گی اور وہ بیوہ عورت دوسری شادی کرے گی۔)

ساون شکلا سپت مں چھپکے اوگے بھان
تب تک برکھا جانیے جب تک دیو اٹھان

(ساون کے مہینے میں آسمان میں بادل چھائے رہیں اور سورج کبھی نکلے اور کبھی بادلوں کی اوٹ میں چھپ جائے اور دیو آسمان پر سوتے رہیں تب تک بارش کا موسم رہے گا۔)

ان دیہی اور زرعی کہاوتوں میں کس قدر سائنسی خزانہ بھرا ہوا ہے۔ یہ کہاوتیں صرف تجربے کی بنا پر کہی گئی ہیں جو آج کے سائنسی دور میں بھی بالکل صحیح ہیں۔ موسم کا پہلے سے علم ہواؤں کے رُخ کو دیکھ کر بجلی کے چمکنے کی سمت کو دیکھ کر اور بادلوں کی اشکال سے کسانوں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ کب اور کتنا پانی برسے گا یا بارش نہیں ہوگی۔ اسی لحاظ سے وہ کھیتی کو کامیاب بنایا کرتے تھے۔ کبھی سینچائی کے ذریعے اور کبھی بارش کے زیادہ پانی کو کھیت سے نکال کر وہ اپنی کھیتی اور فصلوں کو کامیاب بنایا کرتے تھے۔ آج کے سائنسی دور میں جب کہ مصنوعی سیاروں کے ذریعے موسم کا پہلے سے ہی علم ہو جاتا ہے کسان اپنی کھیتی کے سلسلے میں ہوشیار رہتا ہے۔ پچھلے کئی سو برسوں سے یہی کسان صرف اپنے تجربے کی بنا پر موسم کا علم حاصل کرتے تھے اور اپنی کھیتی کو کامیاب بنایا کرتے تھے۔

**پودوں کی بیماری پر زرعی کہاوتیں:**

کس موسم میں کون سی ہوا چلے گی اور اس کے اثرات سے پودوں اور فصلوں پر کیا اثر پڑے گا، یہ علم ہمارے کسانوں کو اپنے تجربات کی بنا پر حاصل ہوا ہے۔ اگر آسمان میں مستقل بادل چھائے رہیں اور زمین گیلی ہو تو کس فصل میں کون کون سا کیڑا لگ سکتا ہے۔ اس کا علم زرعی کہاوتوں میں اس طرح دیا گیا ہے۔

نیچے اُود اوپر بدرائی
گھاگھ کہیں گوروئی اب آئی

(آسمان میں بادل چھائے رہیں اور زمین گیلی ہو تو گوروئی نام کا کیڑا فصلوں میں لگ کر ان کو تباہ کر دے گا۔)

پوس ماگھ بہے پُروائی
تب سرسوں کو ماہُن کھائی

(سردی کے موسم میں اگر پُروا ہوا (مشرقی ہوا) چلنے لگے تو ماہن نام کا کیڑا سرسوں کی فصل کو تباہ کر دے گا۔)

گیہوں گوروئی، گندھی دھان
بنا ان کے مرا کسان

(گیہوں کی فصل میں اگر گوروئی نام کا کیڑا لگ جائے اور چاول کی فصل میں گندھی نام کا کیڑا لگ جائے تو ساری فصل تباہ ہو جاتی ہے اور کسانوں کو زبردست نقصان برداشت کرنا ہوتا ہے۔)

پھاگن ماس بہے پُروائی
تب گیہوں میں گوروئی آئی

(پھاگن کے مہینے میں اگر مشرقی ہوائیں چلتی رہیں تو گیہوں کی فصل کو گوروئی نام کا کیڑا تباہ کر دے گا۔)

چنا ماں سردی بہت سمائی
تاکو جان گدھیلا کھائی

(اگر بہت سردی پڑ رہی ہو تو گدھیلا نام کا کیڑا چنے کی فصل میں لگ کر اسے خراب کر دے گا۔)

چھیدا بھلا جب چنا، چھیدی بھلی کپاس
اور جن کی چھیدی اوکھڑی، ان کی چھوڑو آس

(اگر چنے کی فصل میں کیڑا لگ جائے یا کپاس کی فصل میں کیڑا لگ جائے تو اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا گنے کی فصل میں لال رنگ کا کیڑا لگ جاتا ہے اور اسے پوری طرح تباہ کر دیتا ہے۔)

جیکرے اُوکھڑی لگے لوہائی
تبھی پر آوے بڑی تباہی

(گنے کی فصل میں کیڑا لگ جانے سے گنا اندر سے لال رنگ کا ہو کر خراب ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کسان کے گنے کی فصل میں لوہائی نام کا کیڑا لگ جائے تو کسان کو بہت نقصان ہوتا ہے۔)

فصلوں میں بیماری لگنا اور ان کیڑوں کی پہچان جو مختلف پودوں میں لگ کر اس کو خراب کر دیتے ہیں، اس بات کو کسان اپنے مشاہدے کی بنا پر پہچانتے ہیں اور کیمیائی دواؤں کی ایجاد سے پہلے بھی وہ اس کا علاج کر لیا کرتے تھے اور اپنی کھیتی کو بیماریوں سے محفوظ رکھتے تھے۔

**دیگر زرعی کہاوتیں:**

صحیح وقت پر سینچائی، نرائی، محنت اور دیکھ بھال کی جائے تو کھیتی بہت عمدہ ہوسکتی ہے۔ کسان نقدی فصلیں بو کر بہت فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ فصلوں کی سینچائی اور کٹائی کب ہونی چاہیے، ملی جلی کھیتی کے کیا فائدے ہیں، ان کو کسان زرعی کہاوتوں کی شکل میں اچھی طرح جانتے ہیں۔

گیہوں آیا بال
کھیت بناؤ تال

(جب گیہوں کے پودے میں اناج کی بال نکل آئے تو اس وقت کھیت کو سینچنا چاہیے۔)

کالے پھول نہ پایا پانی
دھان مرا ادھ بیچ جوانی

(دھان کے پودوں میں جب کالے کالے پھول آنے لگیں تو اس کی سینچائی بہت ضروری ہے۔ اگر اس وقت پانی نہ دیا گیا تو دھان کی فصل مرجھا کر ختم ہوجائے گی۔)

جو جل شاڑھ لگتے ہی برسے
ناج نیاز بن کوئی نہ ترسے

(اساڑھ کے مہینے میں بارش ہوجانے سے فصلیں اچھی ہوتی ہیں جس سے کسانوں کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ کوئی نہ تو اناج کے لیے پریشان رہتا ہے اور نہ ہی نیاز و فاتحہ کے لیے اناج کی کمی ہوتی ہے۔)

خربوزہ چاہے دھوپ کو اور آم چاہے مینھ
ناری چاہے جور کو اور بالک چاہے نیہہ

(خربوزے کی فصل کو دھوپ چاہیے اور آم کو بارش کا پانی چاہیے تب ہی یہ دونوں فصلیں عمدہ تیار ہوتی ہیں جس طرح عورت طاقت ور مرد کو پسند کرتی ہے اور بچے پیار پاکر کھل اٹھتے ہیں۔)

کھیت کی نرائی بھی بہت ضروری کام ہے۔ کھر پتوار فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں اور ان کے کھانے کو چوس لیتے ہیں اور پودوں کو پنپنے نہیں دیتے۔ لہٰذا ان کھر پتوار کو کھیت سے نکالنا بہت ضروری ہوجاتا ہے۔ بغیر نرائی کے اچھی فصل کی امید کرنا بے کار ہوتا ہے۔

دو پتی کیوں نہ نرائے
اب ونت کیوں پچھتائے

(اگر کھر پتوار کھیت سے نکال دیا ہوتا تو فصل عمدہ ہوتی۔ جب کوڑا کرکٹ اور کھر پتوار کھیت سے نہیں نکالا اور اچھی فصل نہیں ملی تو اب پچھتانے سے کیا فائدہ؟)

کھیت بگاڑے کھرتوا، سبھا بگاڑے ذوت
کھیتن ماں کھرپی کرے تاسے بھاگے بھوت

(کھر پتوار فصلوں کو خراب کرتا ہے جس طرح کسی محفل کو برے آدمی خراب کر دیتے ہیں۔ کھیتوں میں کھرپی کے ذریعہ کھر پتوار کو نکال دیا جائے تو عمدہ فصل کی امید کی جاسکتی ہے۔)

کھیتی میں محنت کرنا بہت ضروری ہے۔ ذرا سی لاپرواہی کھیتی کو تباہ کرسکتی ہے۔ جو لوگ کھیتی میں محنت سے جی چراتے ہیں، ان کو نقصان ہی نقصان برداشت کرنا ہوتا ہے۔ دیہی زرعی کہاوتیں اس بات کو کیسے ظاہر کرتی ہیں:

ساون میں سسرار گئے، پوس میں کھائیں پوا
چیت میں پھیلا پوچھت ڈولیں تو ہرے کتنا ہوا

(جب کھیت جوتنے بونے کا وقت آیا تو سسرال چلے گئے اور جب کھیت میں سینچائی، نرائی کا وقت آیا تو مزے سے مال پوا کھاتے رہے اور لاپرواہی برتتے رہے۔ جب فصل کاٹنے کا وقت آیا تو سب سے گھوم گھوم کر پوچھتے رہے کہ بھائی تمھارے کتنا اناج پیدا ہوا؟ چونکہ خود کے تو کچھ پیدا نہیں ہوا، لہٰذا دوسروں کے بارے میں ہی جانکاری حاصل کر کے دل ہی دل میں پچھتاتے رہے۔ کھیتی باڑی میں لاپرواہی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔)

کھیتی راج رجائے
کھیتی بھیک منگائے

(اگر آدمی کھیتی گرہستی میں خوب محنت کرے تو نتیجہ اچھا ہوتا ہے اور اتنا اناج پیدا ہوتا ہے کہ وہ امیر ہوجاتا ہے۔ ہاں، اگر کھیتی کرنے میں وہ جی چراتا رہے تو ظاہر ہے اس کے یہاں کچھ نہ پیدا ہوگا اور وہ غریب کا غریب ہی رہے گا۔)

کھیتی برانی، جیسے راجہ کا انعام

(بغیر سینچائی کے کھیتی ایسی ہی سمجھیے کہ اگر ہوگئی تو قسمت ورنہ نقصان ہی نقصان ہے۔ اس کی مثال راجا کے انعام سے دی گئی ہے کیونکہ راجا کب اور کس بات سے خوش ہوکر انعام دے، کوئی نہیں جانتا۔ یعنی اس بات کا کوئی بھروسا نہیں کہ انعام ملے گا بھی یا نہیں۔ اسی طرح بغیر سینچائی کے کھیتی کی کامیابی کا کوئی بھروسا نہیں۔)

اگلی کھیتی آگے آگے
پاچھل کھیتی بھاگے جاگے

(جو کسان وقت سے پہلے فصل پیدا کر کے بازار میں لے آتا ہے اس کو اس کی قیمت بہت اچھی ملتی ہے اور وہ امیر ہوجاتا ہے۔ اور جو کسان سب سے پیچھے فصل اگاتا ہے اس کی امیری یا غریبی اس کی قسمت پر منحصر ہے۔ اگر قسمت اچھی ہوئی تو فصل کی قیمت اچھی مل جاتی ہے اور اگر بازار میں مال پہلے ہی زیادہ آگیا تو اس کی پیداوار کی قیمت اسے زیادہ نہیں ملے گی۔ بلکہ اس کو نقصان بھی ہوسکتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جو چوکس کسان ہیں وہ اپنی فصل جلدی

تیار کر کے پہلے ہی بازار اور منڈی میں لا کر اس کی ڈگنی اور چوگنی قیمت وصول کر لیتے ہیں۔ کھیتی کرنے میں آدمی کو زیادہ ہوشیار اور محنتی ہونا چاہیے۔)

کس کے جوتے، کس کے بوئے، کس کے دے کیاری
بتہ مٹنے نہ جانے تو گھاگھ کو دی ہے گاری

(کھیتی میں خوب محنت سے جوتنا، بونا، کیاری بنا کر پانی دینا چاہیے۔ اس طرح محنت کرنے سے ایک بتہ زمین سے ایک من سے بھی زیادہ اناج پیدا ہوگا۔)

تین پانی تیرہ گوڑ
تب دیکھو اُدکھی کا پوڑ

(گنے کی فصل میں تین مرتبہ پانی دینا چاہیے اور تیرہ مرتبہ اس کھیت کی گوڑائی کرنی چاہیے تاکہ گنے کی جڑوں تک تازہ ہوا اور سورج کی روشنی جا سکے۔ اس طریقہ سے گنے کی فصل عمدہ ہوگی۔)

کھیتی، پاتی، بینتی اور گھوڑے کا تنگ
اپنے ہاتھ سنواریے چاہے لاکھ لوگ ہوں سنگ

(کھیتی، خط، درخواست اور گھوڑے کی دیکھ ریکھ اپنے ہاتھ سے کرنا چاہیے۔ دوسروں پر کام چھوڑنے سے خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔)

چینا جی کا لینا، سولہ پانی دینا
بیس بیس کے بچھا ہارے، ہارے بلم نگینا
ایکو بار بہے پروائی، لینا ہے نہ دینا

(غریب کسان ربیع کی فصل کاٹ لینے کے بعد چینا اناج بوتے ہیں مگر اس کے بونے میں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ محنت خود بھی کرنی پڑتی ہے اور بیلوں کو بھی بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس محنت کے باوجود اگر ایک مرتبہ بھی مشرقی ہوائیں چل جائیں تو ساری محنت پر پانی پڑ جاتا ہے اور فصل تباہ ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کھیتی میں محنت بھی سوچ سمجھ کر کرنی چاہیے۔ ایسا اناج نہیں بونا چاہیے کہ وہ محنت کے باوجود نہ پیدا ہو۔)

نقدی فصلوں (Cash Crops) کی پیداوار سے کسانوں کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ زراعتی کہاوتیں اس کے بارے میں کہتی ہیں:

یا تو بوؤ کپاس اور ایکھ
یا تو کھاؤ مانگ کے بھیک

(کپاس اور گنے کی فصل سے کسان کو فوراً روپیہ مل جاتا ہے۔ لہٰذا نقدی فصلیں جیسے گنا اور کپاس ہی بونا چاہیے تاکہ کسانوں کو خوشحالی نصیب ہو۔)

جس کو ہو ٹوٹا مال کا
وہ اوکھ بوئے اسوجکا

(جس کسان کو روپیوں کی ضرورت ہو اس کو نقدی فصل یعنی گنے کی کاشت کرنی چاہیے اور گنے کی اسوجکا قسم بونا چاہیے جو بہت عمدہ ہوتا ہے۔ اس قسم کے گنے سے کسان کو اچھی رقم مل سکتی ہے۔)

ملی جلی کھیتی کرنے کا فائدہ الگ ہی ہے کیونکہ ملے جلے بیج میں سے جو بھی پیدا ہو گیا اس سے کسان کو فائدہ ہی ہوگا۔ زرعی کہاوت اس بات کو اس طرح ظاہر کرتی ہے:

کھیتی کرے گاجا باجا
ہونے لاگے تونے راجا

(سب اناج ملا جلا کر بونے سے جو بھی اچھی طرح پیدا ہوگا وہ کسان کے لیے فائدے مند ہوگا۔)

فصلوں کی کٹائی کب ہونی چاہیے اس کے بارے میں بھی زرعی کہاوت ہے:

دو دن پچھوا، چھ پروائی
گیہوں، جَو کو لیہو دوائی
تاکے بعد اوساوے جو
بھوسا دانہ الگے ہو

(اگر دو دن تک مغربی ہوائیں چل جائیں اور چھ روز تک مشرقی ہوائیں چلنے لگیں تو گیہوں اور جَو کو دوا لینا چاہیے۔ دوانے سے مطلب یہ ہے کہ بیلوں کی جوڑی گیہوں یا جَو کے پودوں کے ڈھیر پر چلتے رہیں تو دانہ اور بھوسا الگ ہو جاتا ہے اور اس دانے اور بھوسے کو الگ کرنے کے لیے ٹوکری سے اُوسا لینا چاہیے۔ اُوسانے سے مراد یہ ہے کہ مغربی خشک ہوائیں جب چل رہی ہوں تو دانہ اور بھوسا کو ٹوکری میں لے کر ہوا کے مخالف رُخ پر گرانا چاہیے۔ ہوا کی تیزی سے دانہ نیچے گر جاتا ہے اور بھوسا چونکہ ہلکا ہوتا ہے، وہ تھوڑی دور پر جا کر گر جاتا ہے۔ اس طرح گیہوں اور جَو کا دانہ اور بھوسا الگ الگ ہو جاتا ہے۔)

**بیلوں کی قسمیں اور ان کی طاقت پر دیہی کہاوتیں:**

آج بھی ہندوستان کے گاؤں میں زیادہ تر کھیتی ہل بیل کے ذریعے ہی کی جاتی ہے۔ کچھ جگہوں پر ٹریکٹر کے ذریعے کھیت جوتے جاتے ہیں، لیکن زیادہ تر کسان ہل بیل پر ہی منحصر ہیں۔ جب بیلوں کو کھیتی میں استعمال کرنا ہی ہے تو ان کی عمدہ قسمیں اور طاقتور بیل کو ہی استعمال کیا جانا چاہیے۔ کسانوں کو اپنے برسہابرس کے تجربات کی بنا پر معلوم ہے کہ کون سا بیل ان کے کام کا ہے اور کون سا نہیں۔ بیلوں کی قسموں اور ان کی طاقت کے بارے میں چند کہاوتیں ملاحظہ کیجیے:

ناٹا کھوٹا بیچ کے چار دھر ندر لیہو
اپنا کام نکار کے اور ہو منگنی دیہو

(چھوٹے اور کمزور بیلوں کی جگہ کسانوں کو مضبوط اور بڑے بیل رکھنے چاہئیں تاکہ اپنی کھیتی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی مدد کر سکیں۔)

ننی بیل بڑا بلوان
تنک میں کر بیہ ٹھاڑھے کان

(مِٹی نسل کا بیل کھیتی کے لیے بہت عمدہ ہوتا ہے۔ ذرا سے اشارے سے وہ کام میں لگ جاتا ہے۔)

بڑ سنگھا جن لیہو مول
کنواں ماں ڈارو روپیہ کھول

(بڑے بڑے سینگوں والا بیل کھیتی کے لیے بیکار ہوتا ہے۔ ایسے بیل کو خریدنے سے بہتر یہ ہے کہ روپیہ کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔)

نیلا کندھا بیگن کھرا
کبھوں نا نکلے کنتا برا

(نیلے کندھے اور بینگنی کھر والے بیل بہت اچھے ہوتے ہیں۔)

نا موہے نادھو الیا کلیا
نا موہے جوتو دائیں
بیس برس تک کروں بردئی
جو نا ملیبوں گائیں

(بیل کہتا ہے کہ اگر مجھے اوبڑ کھابڑ اور بنجر زمین کو نہ جوتنا پڑے اور نہ ہی ہل میں داہنی طرف سے جوتنا پڑے کیونکہ داہنی طرف کے بیل پر بہت زور پڑتا ہے اور گائے سے نہ ملوں تو میری طاقت اتنی زیادہ قائم رہے گی کہ میں بیس سال تک ہل جوت سکتا ہوں۔)

بیل چمکنا جُوت میں اور چمکیلی نار
یہ گاہک ہیں جان کے، لاج رکھو کرتار

(اگر بیل ہل میں جوتا جائے اور وہ بھڑکنے لگے، کبھی کندھے پر سے ہل کی جوا اٹھا اتار پھینکنے کی کوشش کرے تو ایسے بیل سے ہمیشہ خطرہ بنا رہتا ہے۔ جس طرح تیز طرار عورت کسی کو بھی محفل میں بے عزت کر سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر دونوں تیز ہوں تو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں کسان اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتا ہے کہ اے مالک بس ہماری عزت آپ کے ہاتھ میں ہی محفوظ ہے۔)

سینگ مڑے، ماتھا اُٹھا، منہ کا ہووے گول
روم نرم، چنچل کرن، تیز بیل انمول

(جس بیل کے سینگ مڑے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کی پیشانی اٹھی ہوئی اور گول منہ کا ہو اور اس کے بال نرم نرم ہوں اور وہ ذرا سے اشارے پر چلنے کو تیار ہو جائے، ایسے بیل بہت عمدہ ہوتے ہیں اور کھیتی کے لیے بے حد مفید ہوتے ہیں۔)

پونچھ میں جھبا، اینٹھے کان
ایسا بردھ محنتی جان

(جس بیل کے مڑے ہوئے کان ہوں اور دم گچھے دار ہو وہ بیل بہت محنتی ہوتا ہے۔)

**کھاد سے متعلق زرعی کہاوتیں:**

گاؤں کے رہنے والے کسانوں کو کھیتوں میں کھاد ڈالنے کا پورا تجربہ ہوتا ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ کھاد ڈالنے سے زمین کی زرخیزی کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور وہاں فصلیں اچھی پیدا ہوتی ہیں۔ کھاد کے فوائد کے متعلق زرعی کہاوتوں کے مطابق:

کھادے کوڑا نا ٹرے، کرم لکھا ٹری جائے
رہمن کہت بنائے کے دیکھو کھاد بنائے

(تقدیر کا لکھا بدل سکتا ہے مگر کوڑے کی کھاد اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے اور جس کھیت میں کھاد ڈالی جاتی ہے اس میں بہت اناج پیدا ہوتا ہے۔)

سنئی بووے، سنئی کاٹے، سنئی سارے کھیت ماں جھار
اُلٹے پلٹے دونوں جوتے، وہیں لیجے گلا کا جھار

(سنئی کو کھیت میں بو کر، کاٹ کر اسی کھیت میں چھوڑ دیا جائے تو وہ سڑ گل کے بہترین کھاد تیار ہو جاتی ہے۔ یہ ہری کھاد بے حد زرخیزی لاتی ہے اور جو بھی اناج کھیت میں بویا جاتا ہے وہ بہت زیادہ پیدا ہوتا ہے۔)

**فصل چکر کے متعلق زرعی کہاوتیں:**

زمین کی زرخیزی قائم رکھنے کے لیے کھیتی میں فصل چکر (Rotation of Crops) قائم کرنا ضروری ہے۔ بار بار ایک ہی چیز کو بونے سے زمین کی زرخیزی کم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے بدل بدل کر فصلیں اس کھیت میں پیدا کی جاتی ہیں تاکہ زمین کو غذائیت ان پودوں سے ملتی رہے اور اس کی طاقت اور زرخیزی قائم رہے۔ جو تجربہ کار کسان ہیں وہ ہمیشہ فصل چکر کو قائم رکھتے ہیں۔

سانٹھی میں سانٹھی کرے اور باڑی میں باڑی
اونکھ میں جو دھان بووے پھونک دا کی داڑھی

(وہ کسان بہت ہی بیوقوف ہے جو دھان اور کپاس کی کھیتی ایک ہی کھیت میں بار بار کرے۔ دھان بونے کے بعد کپاس بونے سے زمین کی زرخیزی بہت کم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا فصل کچھ نہ ملے گی۔ وہ کسان اور بھی زیادہ بیوقوف ہے جو گنے کی کاشت کے بعد اسی کھیت میں فوراً دھان بووے۔ کیونکہ گنے کی کھیتی نے زمین کی ساری زرخیزی کو چوس لیا۔ ایسے کھیت میں دھان کی کاشت کو زرخیزی نہیں ملے گی جس سے فصل بہت کمزور ہوگی اور کسان کو بہت نقصان ہو جائے گا۔ ایسے کاشت کار کے لیے زرعی کہاوت یہاں تک کہتی ہے کہ اس کی داڑھی میں آگ لگا دو جو اتنا بھی فصل چکر کے بارے میں نہیں جانتا۔)

باڑی میں باڑی کرے اور ایکھ میں ایکھ
وے گھریوں ہی جائیں گے سنیں پرائی سیکھ

(کپاس کی کھیتی کے بعد اسی کھیت میں پھر سے کپاس بونا یا گنے کی فصل لینے کے بعد پھر اسی کھیت میں دوبارہ گنا بونا نہایت ہی بیوقوفی ہوگی کیونکہ پہلی

فصل نے تو زمین کی ساری زرخیزی ختم کر دی۔ اب دوسری فصل کہاں سے ہوگی؟ اگر کسان اپنی عقل استعمال نہیں کرے گا تو اس کو بہت نقصان اسی طرح ہوگا جیسے کوئی آدمی اپنی عقل استعمال نہ کرے اور اپنے گھر کے ہر معاملے میں دوسروں کے کہنے پر چلے۔ ایسے گھر عام طور پر برباد ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا کسانوں کو فصل چکر کے بارے میں پوری معلومات ہونی چاہیے، اسی صورت میں ان کی زراعت میں ترقی ہوگی۔)

**بیج کی مقدار فی بیگھہ کے متعلق زرعی کہاوتیں:**

کتنا بیج ایک بیگھہ زمین میں بونا چاہیے، یہ ایک سائنسی علم ہے جو ہمارے ملک کا کسان اپنے تجربے کی بنا پر جانتا ہے۔ زرعی کہاوتوں میں بیج کی مقدار کے بارے میں اس طرح کہا گیا ہے:

جو گیہوں بووے تین پسیر ۔ مٹر کا بیگھہ تیسے سیر
بووے چنا پسیری تین ۔ تین سیر بیگھہ جونہری کین
پانچ پسیری بیگھہ دھان ۔ تین پسیری جڑہن مان
تلی، سرسوں انجوری جان ۔ سوا سیر بیگھہ ساواں مان
بزرے، کودوں سیر بوواؤ ۔ ڈیڑھ سیر بیگھہ تیسی تاؤ
ڈیڑھ سیر بجرا، بجری ساواں ۔ کودوں، کاکن، سویا بووا
جب یہی ودھی سے بووے کسان ۔ دونے لابھ کی کھیتی جان

(ایک بیگھہ زمین میں پندرہ پندرہ سیر گیہوں اور جو بونا چاہیے اور مٹر کا بیج تیس سیر فی بیگھہ بونا چاہیے۔ چنا پندرہ سیر فی بیگھہ اور جونہری تین سیر فی بیگھہ بونا چاہیے۔ دو سیر موٹھی، ارہر اور ماش کا بیج اور ڈیڑھ سیر کپاس کا بیج فی بیگھہ کافی ہوتا ہے۔ بونے کے لیے 25 سیر دھان اور 15 سیر جڑہن کا بیج فی بیگھہ کافی ہے۔ تلی، سرسوں کا ایک ایک مٹھی بیج اور سوا سیر ساواں کا بیج مناسب ہے ایک بیگھہ کے لیے۔ بزرے اور کودوں ایک ایک سیر اور ڈیڑھ سیر تیسی (تیل کا بیج) فی بیگھہ بونا چاہیے اور کودوں اور کاکن سوا سیر فی بیگھہ بونے کے لیے کافی ہے۔ جب کسان اسی طریقے سے اور اسی مقدار سے بیج فی بیگھہ کے حساب سے بوئے گا تو اس کو کھیتی میں دوگنا فائدہ ہوگا۔)

**بیج بونے کے طریقے پر زرعی کہاوتیں:**

ہندوستانی کسان اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ کھیت میں بیج کتنی کتنی دوری پر بونا چاہیے۔ اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر انھوں نے اس بات کو زرعی کہاوتوں میں ظاہر کیا ہے:

کدم کدم پر باجرہ، مینڈھک کدونی جوار
ایسے بووے جو کوئی، گھر گھر بھرے کوٹھار

(باجرے کا بیج ایک ایک قدم کے فاصلے سے بونا چاہیے اور جوار کے بیج کا فاصلہ مینڈک کے کودنے کی دوری تک ہونا چاہیے۔ اس طرح بونے سے فصلوں کی پیداوار بہت عمدہ ہوگی۔ بہت قریب قریب بیج ڈالنے سے باجرہ اور جوار جھاڑ جھنکاڑ کی شکل میں آئیں گے اور زمین کی اور پودوں کی زرخیزی کو چوس کر فصل بے کار کر دیں گے۔)

سن گھنا بن بیگھوا، مینڈک پھندے جوار
پیگ پیگ پر باجرہ، کرے دریدر پار

(سنئی کی کھیتی بہت گھنی ہونی چاہیے اور جوار کے بیج کو مینڈک کے کودنے کی دوری پر بونا چاہیے۔ قدم قدم فاصلے سے باجرہ کا بیج بونا چاہیے۔ اس طریقے سے ان کو بونے سے فصل بہت عمدہ تیار ہوگی اور کسان کی غریبی دور ہو جائے گی۔)

پہلے ککڑی، پیچھے دھان
اس کو کہیے پور کسان

(دھان کی کھیتی سے پہلے جو کسان ککڑی کی فصل پیدا کر لیتا ہے دراصل وہی کامیاب کسان ہے۔)

ہرن چھلانگے کاکڑی، پگ پگ رہی کپاس
جائے کہو کسان سے بووے گھنی اوکھاس

(ککڑی بونے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہرن کی چھلانگ کے فاصلے سے بوئے جائے اور کپاس کو قدم قدم فاصلے سے بونا چاہیے۔ کسان کو اس بات کا بھی علم ہونا چاہیے کہ گنے کو بہت گھنا بونا چاہیے۔ تب ہی اس کو عمدہ فصل ملے گی۔)

ان سب زرعی اور دیہی کہاوتوں کو پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سیکڑوں سال کے کسانوں کے تجربوں میں سائنسی خزانہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جس زمانے کی یہ کہاوتیں ہیں یعنی پانچ سو سال سے بھی زیادہ عرصے کی، اس وقت سائنسی علم عروج پر نہیں تھا جتنا آج ہے۔ موسم کا پہلے سے اندازہ ہمیں مصنوعی سیاروں کے ذریعے معلوم ہو جاتا ہے مگر پہلے لوگ بادلوں کے اشکال ہواؤں کے رخ اور بجلی چمکنے کی سمت کو دیکھ کر بارش کا اندازہ لگاتے تھے۔ ان کہاوتوں میں صدیوں کے مشاہدات و تجربات کا نچوڑ ہے جو سینہ بہ سینہ ہوتی ہوئی آج ہم تک پہنچی ہیں۔ یہ ہمارا علمی خزانہ ہے جس کو ہمیں سنبھال کر رکھنا ہے اور اس کو بہ حفاظت اپنی آنے والی نسلوں کے حوالے کرنا ہے تاکہ وہ بھی اس بیش بہا خزانے سے فائدہ اٹھا سکیں اور اپنی کھیتی کے فروغ میں چار چاند لگا سکیں۔

□□□

رابطہ:
46, Nishat Apartment
Aligarh Muslim University
Aligarh (U.P.)

بھرت جھن جھن والا

# ہر شعبے میں روزگار کو فروغ دینے کی ضرورت

بنگال کی سرکار ایک ہزار ایکڑ زرعی زمین کو ایکوائر کر کے ٹاٹا گروپ کو کار بنانے کا کارخانہ لگانے کے لیے دے رہی ہے۔ دیہی ترقیات کی وزارت کے سابق سکریٹری ڈی بندواپادھیائے لکھتے ہیں کہ اس سے زرعی شعبے میں تقریباً 1400 روزگار کم ہو جائیں گے اور پیداوار کے شعبے میں صرف 300 روزگار پیدا ہوں گے۔ اسی طرح کرناٹک سرکار بڑی سافٹ ویئر کمپنیوں کی توسیع کے لیے سیکڑوں ایکڑ زمین کو ایکوائر کرنے جا رہی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ روزگار کے نقطۂ نظر سے زراعت کو ختم کر کے صنعتیں لگانا دودھ دینے والی گائے کو بیچ کر سوکھی گائے خریدنے کی طرح ہے۔

یہ غیر متنازعہ ہے کہ زراعت میں روزگار زیادہ ہیں۔ قومی محنت کمیشن کی رپورٹ کے مطابق سال 2000 میں زراعت میں 23.8 کروڑ افراد برسر روزگار تھے۔ جب کہ صنعتوں میں صرف 4.9 کروڑ اور خدمت کے شعبے میں 11.0 کروڑ۔ خدمت کے شعبے میں بجلی، تجارت، بینکنگ، تعلیم، دفاع وغیرہ آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آج بھی زراعت میں روزگار زیادہ ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ مستقبل میں یہ روزگار برقرار رہیں گے یا زراعت کی توسیع سے ان میں اضافہ ہوگا۔ سبب یہ ہے کہ زراعت میں نئے روزگار کم تعداد میں پیدا ہو رہے ہیں۔ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق 1983 اور 2000 کے درمیان زراعت میں روزگار میں 15 فیصد کا اضافہ ہوا جب کہ صنعت میں 36 فیصد کا اور خدمات کے شعبے میں 86 فیصد کا۔ جس طرح بوڑھی گائے زیادہ دودھ دے تب بھی بچھیا پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے اسی طرح زراعت میں اس وقت زیادہ روزگار پیدا ہونے کے باوجود صنعت اور خدمات کے شعبوں پر زیادہ توجہ دی جانی چاہیے۔ کیونکہ نئے روزگار ان شعبوں میں ہی پیدا ہو رہے ہیں۔

صنعت اور خدمت کے شعبوں میں پیداوار کے مقابلے میں روزگار کم پیدا ہوتے ہیں۔ وزارت خزانہ کے ذریعہ شائع اقتصادی سروے کے مطابق سال 2000 میں زرعی پیداوار 496 ہزار کروڑ روپے تھی، صنعتی پیداوار 414 ہزار کروڑ روپے اور خدمات کے شعبے کی پیداوار 882 ہزار کروڑ روپے تھی۔ اس مضمون کے شروع میں دیے گئے روزگار کے اعداد و شمار کو پیداوار سے تقسیم کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مسلسل پیداوار کے مختلف شعبوں میں کتنے روزگار تیار ہو رہے ہیں۔ زراعت میں ایک کروڑ روپے کی پیداوار کرنے میں 480 روزگار بنتے ہیں۔ جب کہ صنعت میں اتنی ہی پیداوار میں صرف 118 اور خدمات کے شعبے میں 125 روزگار پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی زرعی پیداوار میں محنت کا حصہ زیادہ ہے۔ صنعت اور خدمات کے شعبے میں نئے روزگار ضرور پیدا ہو رہے ہیں لیکن مزدوری کا حصہ کم ہے۔

ہمارے سامنے سنگین مسئلہ ہے۔ زرعی شعبے میں شرح ترقی کم ہے اور نئے روزگار کم پیدا ہو رہے ہیں لیکن صنعت اور خدمات کے شعبے میں محنت کا حصہ کم ہے۔ اس طرح کسی بھی شعبۂ خاص کی ترقی سے روزگار کا مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ اقتصادی ترقی کے ساتھ تمام ممالک کی آمدنی میں زراعت کا حصہ کم ہوتا جاتا ہے اس لیے زراعت میں ترقی کی حد ہے لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ زراعت پر توجہ کرنے سے خاطر خواہ تعداد میں روزگار پیدا ہو جائیں گے۔ دوسری طرف صنعت اور خدمت کے شعبے میں محنت کا حصہ کم ہوتا ہے لہٰذا یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ان شعبوں کے فروغ سے خاطر خواہ تعداد میں روزگار پیدا ہوں گے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ روزگار کے مسئلے کا حل کسی بھی شعبۂ خاص سے نہیں نکلے گا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ 1983 اور 2000 کے درمیان ملک کی آبادی میں تقریباً 31 کروڑ روپے کا اضافہ ہوا ہے۔

مزدوروں کی تعداد میں اس کا نصف اضافہ مان لیں تو تقریباً 15 کروڑ لوگ محنت کے بازار میں داخل ہوئے ہیں۔ لیکن تمام شعبوں میں کل ملا کر صرف 9.5 کروڑ روزگار پیدا ہوئے ہیں۔ ملک میں بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جب کہ ماہرین اقتصادیات ان غیر ضروری تنازعات میں پھنسے ہوئے ہیں کہ زراعت سے روزگار پیدا ہوں گے یا پیداوار اور خدمات کے شعبے سے۔ درحقیقت روزگار کا مسئلہ قطعاً مختلف ہے، تینوں ہی شعبوں میں روزگار پیدا ہو سکتے ہیں اگر سرکار فروغ دے۔ زرعی پیداوار سرمایہ پر مبنی تکنیکوں سے ہو سکتی ہے اور محنت پر مبنی تکنیکوں سے بھی۔ ہریانہ کے دیہاتوں میں سرمایہ پر مبنی زرعی پیداوار ہوتی ہے کسان شہر میں رہتے ہیں۔ وقت پر گاؤں آ کر ٹریکٹر سے جتائی اور بوائی کرتے ہیں۔ اسپرنکلر سے آبپاشی ہوتی ہے۔ کٹائی ہارویسٹر سے کی جاتی ہے۔ بھوسے پیرے کو کاغذ وغیرہ کی پیداوار

کے لیے شہروں کو بھیج دیا جاتا ہے جس سے گوبر گم بنتا ہے۔ گوبر کی کھاد کی جگہ کیمیائی کھاد استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس طرح زراعت میں جو روزگار پیدا ہو سکتے تھے وہ بھی نہیں ہو رہے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ سرکار نے ٹریکٹر پر قرض کی سہولت اور ڈیزل اور کیمیائی کھادوں پر سبسڈی دے رکھی ہے لہٰذا سرکاری پالیسیاں زراعت میں روزگاری کی کے لیے ذمہ دار ہیں۔

تقریباً یہی صورت حال صنعتوں میں ہے۔ بیس سال قبل جس چینی مل میں 1500 ملازمین کام کرتے تھے آج وہاں صرف 600 کام کر رہے ہیں۔ کئی کاموں کو ماضی میں مزدوروں کے ذریعہ کیا جاتا تھا جسے خودکار مشینوں کے ذریعے کیا جا رہا ہے۔ مثلاً ٹرک سے گنّے کو اتارنا، کوئی کو بوائلر میں ڈالنا، سینٹری فیوگل مشین میں چینی اور مولیسس کو الگ کرنا وغیرہ۔ سبب یہ ہے کہ سرکار مشین میں سرمایہ کاری پر سبسڈی یا دیگر سہولیت دیتی ہے۔ اس کے برعکس زیادہ تعداد میں مزدوروں کو روزگار دینے پر سخت لیبر قوانین نافذ ہو جاتے ہیں۔ ان پالیسیوں کے سبب صنعت کار کے لیے مشین کا استعمال کرنا فائدہ مند اور محنت کا استعمال کرنا خسارے کا سودا ہے۔

خدمات کے شعبے میں بھی اسی طرح کی صورت حال ہے۔ دلی کے چاندنی چوک اور کولکاتہ کے بڑے بازاروں میں ہزاروں لوگ رکشہ چلا کر زندگی گزار رہے ہیں۔ پانچ ہزار کی سرمایہ کاری سے وہ ہر ماہ پانچ ہزار روپیہ کما لیتے ہیں۔ یہ محنت پر مبنی ٹرانسپورٹ نظام ہے لیکن رکشے کو پسماندگی کی علامت مانا جاتا ہے اس لیے کولکاتا میں رکشے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ جس ٹرانسپورٹ سے ایک ہزار لوگ روزگار پاتے تھے وہ اب دو سو لوگوں کے ذریعہ کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ ڈیزل، پٹرول کے زیادہ استعمال سے آلودگی بھی بڑھ رہی ہے اور ملک درآمد شدہ تیل وغیرہ پر منحصر ہوتا جا رہا ہے۔ شہر کے اہم چوراہوں پر آٹومیٹک لائٹیں لگا دی جاتی ہیں جو سرمایہ پر مبنی ہوتی ہیں اور غیر ماہر بھی۔

درحقیقت روزگار کا موضوع کسی خاص شعبے سے وابستہ نہیں ہے یہ ماننا غلط ہے کہ زراعت، صنعت اور خدمات کے شعبے کے فروغ سے روزگار خود پیدا ہو جائیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شعبے میں روزگار پیدا کرنے کو واضح طور پر فروغ دیا جائے۔ موجودہ پالیسیاں ہر شعبے میں سرمایہ پر مبنی پیداوار کو فروغ دیتی ہیں۔ اس لیے زراعت کی جگہ خدمات کے شعبے کو فروغ دینا یا خدمات کے شعبے کی جگہ پر زراعت کو فروغ دینا کنویں سے نکل کر کھائی میں گرنے جیسا ہے۔

□□□

**رابطہ:**
Lakshmoli, PO Maletha
Via Kirti Nagar, Dt Tehri Garhwal
Uttaranchal-249161

## احمقوں کی جنت

**مصنف: شنکر / مترجم: ڈاکٹر شریف احمد**

''احمقوں کی جنت'' میں بچوں کے لیے 12 چھوٹی چھوٹی مزیدار اور سبق آموز کہانیاں ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے بچے اپنی ہنسی روک نہیں سکتے۔

ہر کہانی کے ساتھ کارٹونی تصویر بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 24، قیمت: -/12 روپے

## ربن

**مصنف: سوکمار شنکر / مترجم: کے. پی. رائے زادہ**

بچوں کو اپنے کھلونے، میک اپ اور کھیل کود سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے اور وہ ان موضوعات پر خوب مزے لے لے کر باتیں کرتے ہیں۔ انھی سامانِ تفریح میں ایک ''ربن'' ہے جو مالا کی سالگرہ پر اس کی ماں دیتی ہے۔ یہ ''ربن'' کس کس طریقے سے اس تک پہنچتی ہے کہانی میں اس کا پرتجسس بیان بچوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

صفحات: 16، قیمت -/15 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

مجتبیٰ حسین

# اردو مشاعرے اور بیرونی سیاح

بہت عرصہ پہلے سویڈن سے آئے ہوئے ہمارے ایک غیر ملکی دوست نے (جو اردو بالکل نہیں جانتے) ہم سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ کسی اردو مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے انھیں اس وقت اردو مشاعرے سے دور رکھنے کی بساط بھر کوشش کی تھی لیکن وہ برابر مصر رہے کہ اردو مشاعروں کا بڑا شہرہ سنا ہے۔ دیکھیں تو سہی یہ کیا ہوتا ہے اور کیسا ہوتا ہے۔ ان کی خواہش کے احترام میں ہم انھیں ایک ایسے اردو مشاعرے میں لے گئے تھے جس میں کئی نامی گرامی شعرا نے شرکت کی تھی۔ شعر تو خیر ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتے۔ لیکن مشاعرے میں ایک مرحلے پر داد کا جب بے پناہ شور بلند ہونے لگا اور لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کر داد دینے کی خاطر شاعر کی طرف بڑھنے لگے تو ہمارے غیر ملکی دوست نے ''آداب مشاعرہ'' سے عدم واقفیت کی بنا پر یہ سمجھ لیا کہ یہ لوگ شاعر پر حملہ کرنے کا ناپاک ارادہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا فوراً بیچ میں کود پڑے اور داد دینے والے سامعین سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہنے لگے ''یہ ایک نہایت انسانیت سوز حرکت ہے کہ آپ ایک نہتے اور اکیلے انسان کے ساتھ ایسا غیر انسانی برتاؤ کر رہے ہیں۔ آپ میں ہمت ہے تو ایک ایک کر کے اس کا مقابلہ کریں۔'' وہ تو اچھا ہوا کہ اکثر سامعین انگریزی نہیں جانتے تھے اور یہ اردو نہیں جانتے تھے۔ لہٰذا معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ان کی اس بیجا مداخلت پر سب سے زیادہ اعتراض اس شاعر کو ہی تھا جس کی حمایت میں انھوں نے آواز اٹھائی تھی۔ اس پر ہمارے غیر ملکی دوست کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کہنے لگے ''صاحب! اردو شاعر بھی عجیب و غریب مخلوق ہے۔ میں تو انسانی ہمدردی کے ناتے اس کی مدد کرنا چاہتا تھا اور وہ الٹا مجھ سے ناراض ہوا جاتا ہے۔'' ہم نے انھیں سمجھایا کہ اردو شاعری اور اردو شاعر دونوں کبھی آپ کی سمجھ میں نہ آسکیں گے۔ دور کیوں جایئے، خود ہمیں دیکھ لیجیے کہ اردو ماحول اور تہذیب میں پلے بڑھے ہیں لیکن آج تک صحیح معنوں میں شاعری ہماری سمجھ میں نہ آسکی۔ کبھی شاعری سمجھ میں آگئی تو شاعر سمجھ میں نہیں آیا اور اگر شاعر سمجھ میں آگیا تو اس کی شاعری ہمارے پلے نہیں پڑی۔ اسی لیے ایک عرصے سے خود ہم نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا ہے۔ کیوں کہ تضیع اوقات کے لیے ہم نے اس سے کہیں زیادہ بہتر بہانے تلاش کر لیے ہیں۔

لیکن پچھلے دنوں ہمیں پھر ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کا موقع ملا اور اتفاق دیکھیے کہ اس بار بھی ہمیں ایک غیر ملکی کے ساتھ ہی مشاعرے میں جانا پڑا۔ اب کے ہمارے ایک جاپانی دوست (جو اردو بالکل نہیں جانتے) ہندوستان آئے تو کہنے لگے اردو مشاعروں کا بڑا شہرہ سنا ہے، دیکھیں تو سہی یہ کیسا ہوتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔ ہم نے انھیں بہتیرا سمجھایا کہ حضور آپ اردو مشاعرے کو دیکھنے کی تاب نہ لاسکیں گے۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ ہم چڑیا گھر دیکھ لیں۔ وہاں بھی بھانت بھانت کے جانور آپ کو دیکھنے کو مل جائیں گے۔ بولے ''چڑیا گھر تو ہمارے ٹوکیو میں بھی ہے۔ مگر آپ جن ''جانداروں'' کا ذکر کر رہے ہیں وہ ہمارے چڑیا گھر میں پائے نہیں جاتے۔'' سچ تو یہ ہے کہ سویڈن والے دوست کے تلخ تجربے کی روشنی میں ہم اپنے جاپانی دوست کو بہت ڈرتے ڈرتے مشاعرہ میں لے گئے تھے۔ مشاعرے کے دوران ان پر کڑی نظر بھی رکھی کہ وہ کہیں انسانیت کے جذبے سے مغلوب ہو کر ڈائس پر نہ پہنچ جائیں۔ یہ ضروری ہے کہ مشاعرے میں جانے سے پہلے ہم نے انھیں ''آداب مشاعرہ'' کے بارے میں کچھ ضروری باتیں بتا دی تھیں کہ داد کس طرح دی جاتی ہے، شاعر کس طرح سلام کرتا ہے، صدر مشاعرہ کس طرح اونگھتا رہتا ہے۔ خاتون شعرا کم عمر نظر آنے کے لیے کیا کیا حربے استعمال کرتی ہیں۔ ناظم مشاعرہ سے ان کی نوک جھونک کس طرح چلتی ہے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ وہ اتنی جلدی ''آداب مشاعرہ'' کو جان لیں گے۔ چنانچہ وہ مشاعرے میں گئے تو یوں نظر آئے جیسے مشاعروں کے ''عادی سامع'' ہوں (عادی سامع اور عادی مجرم میں ہمیں بہت زیادہ فرق نظر نہیں آتا)۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ انھوں نے سمجھا کہ مشاعرہ بھی اصل میں ایک ڈراما ہے جس میں ہر کردار (بشمول سامعین کے) پہلے سے طے شدہ ریہرسل کے مطابق کام کرتا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب ہم مشاعرہ گاہ میں پہنچے تو ڈائس پر بیٹھے ہوئے بھانت بھانت کے شعرا کے مختلف النوع لباس اور حلیے کو دیکھ کر انھوں نے پوچھا کہ ان شاعروں کے (Costumes) یعنی لباس منتظمین مشاعرہ فراہم کرتے ہیں یا اس کی ذمہ داری خود شاعروں کی ہوتی ہے۔ ہم نے کہا ''لباس تو ان کا اپنا ہوتا ہے''۔ پوچھا ''اور جو یہ لوگ مشاعرے میں کلام سناتے ہیں تو وہ بھی ان ہی کا ہوتا ہے یا منتظمین مشاعرہ اپنی طرف سے کلام فراہم کرتے ہیں؟''۔ اس معصوم مگر مشکل سوال کا جواب خود ہمیں بھی نہیں معلوم تھا۔ بلکہ ہم نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ لہٰذا ہم نے کہا ''آپ نے عجیب و غریب سوال پوچھا ہے۔ اس کا آسان جواب دینے کے ہم بھی اہل نہیں ہیں۔ سچ پوچھیے تو ہمیں بھی اکثر یہ شبہ ہوتا ہے کہ بیشتر شعرا کا کلام یا تو منتظمین مشاعرہ فراہم کرتے ہیں یا کوئی اور انھیں فراہم کرتا ہے۔ پھر بھی عام طور پر یہ

سمجھا جاتا ہے کہ شعرا کا کلام ان کا اپنا ہوتا ہے۔ اب وہ کسی سے اصلاح لیتا ہے یا نظرِ ثانی کرواتا ہے تو یہ اس کا اور اصلاح دینے والے کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔" پھر انھوں نے پوچھا کہ" اور یہ جو کلام پر سامعین کی طرف سے داد دی جاتی ہے تو کیا اس کی مقدار بھی پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے کہ کس کے کلام پر کتنی داد دی جائے گی؟ ہم نے کہا" داد دینے کا معاملہ بھی مشکوک ہے۔ اکثر شعرا اپنے سامعین اپنے ساتھ لے آتے ہیں اور جن کے داد دینے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ابھی شاعر صرف" عرض کیا ہے" ہی کہتا ہے اور ادھر اس کے سامعین" مکرر ارشاد" کا نعرہ بلند کر دیتے ہیں۔ بے ساختہ داد وہی ہوتی ہے جو بنا سوچے سمجھے دی جائے۔" پھر ہمارے جاپانی دوست نے ایک شاعر کے لمبے اور بکھرے ہوئے بالوں کی طرف اشارہ کر کے کہا" یہ بال مصنوعی ہیں یا اصلی؟" حیرت سے کہنے لگے" ایسے بالوں کے ساتھ کسی کا نارمل حالت میں زندہ رہنا اور اوپر سے شعر کہنا واقعی کمال کی بات ہے۔ ایسے بال اگر میرے سر پر ہوں تو بلا شبہ میں اپنے کپڑے پھاڑ کر جنگل کی طرف نکل جاؤں۔ کیا ان بالوں کو دیکھ کر آپ میں وحشت کے آثار نہیں پیدا ہو رہے ہیں؟" ہم نے کہا" ہمارے اکثر شاعر تو اب بال بھی بنوانے لگے ہیں اور جمعہ کے جمعہ نہا بھی لیتے ہیں۔ جو شیروانی سال میں ایک بار دھلتی تھی اب مہینہ میں ایک بار دھلنے لگی ہے۔ لیکن کچھ برس پہلے تک اردو شاعروں کا مقبول و معروف حلیہ یہی رہا ہے۔"

اس پر ہمارے جاپانی دوست بڑی دیر تک اردو شاعر کے حوصلے کی داد دیتے رہے۔

مشاعرے میں جب ایک مرحلے پر سامعین نے ایک شاعر پر انڈے اور ٹماٹر پھینکنے شروع کیے تو ہمارے جاپانی دوست نے ہم سے پوچھا" مجھے لگتا ہے اس شاعر کا کلام بہت اچھا ہے، تبھی تو سامعین اس پر کھانے پینے کی چیزیں پھینک رہے ہیں۔ دیگر شاعروں کو تو صرف روکھی سوکھی زبانی داد دی گئی جب کہ اس شاعر کو کھانے پینے کی چیزوں اور نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے۔" اب ہم انھیں کیا سمجھاتے کہ اردو مشاعرہ ہماری وہ عظیم روایت ہے جس کے اسٹیج پر جہاں تہذیب کے نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں بد تہذیبی کے مناظر بھی نظر آتے ہیں۔ جسے ہم ہوٹنگ کہتے ہیں اسے بھی وہ" داد" بلکہ" بے ساختہ داد" سمجھ بیٹھے تھے۔ ہم نے ان کی غلط فہمی دور کرنی بھی نہیں چاہی کیوں کہ انھیں کون سا بار بار مشاعروں میں جانا تھا۔ مشاعرے کو دیکھ کر (ظاہر ہے کہ مشاعرہ ان کے لیے سننے کی چیز تو تھا ہی نہیں) وہ بہت خوش تھے۔ باہر نکلے تو کہنے لگے" مجھے صدر مشاعرہ کا کردار بہت اچھا لگا۔ لگاتار چار گھنٹوں تک وہ مسند صدارت پر بیٹھا رہا۔ ایک بار بھی اس نے پہلو نہیں بدلا۔ ایک بار بھی وہ اسٹیج سے اٹھ کر کہیں نہیں گیا جب کہ دیگر شعرا حضرات بار بار اٹھ کر اسٹیج کے پیچھے جا رہے تھے۔ یہ اسٹیج کے پیچھے کیوں جا رہے تھے؟ کیا نئے شعر کہنے کے لیے جا رہے تھے؟"

یہ ایسے سوالات تھے جن کے صحیح جواب ہم دے دیتے تو اردو مشاعرہ کی روایت کے بارے میں ان کے ذہن میں کئی شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔ اسی لیے ہم نے موضوع کا رُخ موڑ دیا اور انھیں خاتون شعرا کے ترنم میں الجھا دیا۔

❑❑❑

**رابطہ:**

502, Maphar Regency
A.C. Guards, Hyderabad-500004
(Andhra Pradesh)

**حیاتِ جاوید**

**مصنف: الطاف حسین حالی**

مولانا الطاف حسین حالی نہ صرف ایک رجحان ساز شاعر اور نقاد تھے بلکہ انھوں نے سوانح نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا اور" حیات سعدی"،" یادگار غالب" اور" حیات جاوید" جیسی کتابیں یادگار چھوڑیں۔" حیات جاوید" میں حالی نے سرسید کی زندگی کے حالات، افکار اور خیالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یوں بھی ہے کہ حالی سرسید سے بے حد قریب تھے اور سرسید نے ملک و قوم کی جو خدمت کی اس کے عینی شاہد۔

پانچواں ایڈیشن، صفحات: 907، قیمت: -/181 روپے

**کلیاتِ چودھری محمد علی ردولوی (تین جلدوں میں)**

**ترتیب و تدوین: مسعود الحق**

چودھری محمد علی ردولوی اپنے زمانے کے ایک روشن خیال اور شگفتہ نگار ادیب تھے۔ ان کا تعلق انیسویں صدی کے ادیبوں کی اس نسل سے تھا جس میں ولایت علی بمبوق، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، مولانا ابو الکلام آزاد اور نیاز فتح پوری وغیرہ شامل تھے۔ اس کلیات میں ان کی تمام تحریریں جمع کر دی گئی ہیں۔

جلد اوّل، صفحات: 344، قیمت: -/172 روپے
جلد دوم، صفحات: 455، قیمت: -/172 روپے
جلد اوّل، صفحات: 450، قیمت: -/172 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110 066

سلام بن رزاق

# باقر مہدی سے چند آدھی ادھوری ملاقاتیں

باقر صاحب سے میرے مراسم کیسے تھے؟ کتنے تھے؟ اور کیوں تھے؟ تھے بھی یا نہیں؟ یہ سب سوالات تشنہ ہیں۔ اگر میں ان کے جوابات دینے کی کوشش کروں تو شاید جوابات بھی تشنہ ہی رہیں گے۔

میری ناقص رائے میں دو افراد کے درمیان تعلقات کبھی یکساں نہیں رہتے۔ وقت کے ساتھ ان کے مابین مختلف جذبوں کی لہریں ڈوبتی ابھرتی رہتی ہیں۔ محبت کی تہہ میں کہیں ہلکی سی نفرت بھی بکل مارے بیٹھی رہتی ہے اور کبھی نفرت کے پردے میں محبت کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہوتا ہے۔ ورنہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ برسہا برس کی دوستی کسی معمولی سی بات پر فوراً دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی ایک چھوٹا سا واقعہ برسوں کی دشمنی کو دوستی کے روپ میں بدل دیتا ہے۔ زندگی مجموعہ اسرار ہے اور تمام انسانی رشتے اسی کے محور پر گردش کرتے ہیں۔ باقر مہدی نے زندگی کی اسی بوقلمونی کو اپنے مشہور شعر میں اس طرح پیش کیا ہے:

مجھے دشمن سے اپنے عشق سا ہے  
میں تنہا آدمی کی دوستی ہوں

جنھوں نے باقر صاحب کو قریب سے دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ شعر ان کی شخصیت کی پہچان بن گیا تھا۔ مشہور مزاح نگار جناب یوسف ناظم کے خاکے کا یہ بلیغ جملہ ان کی شخصیت پر کس قدر صادق آتا ہے

''اگر سب لوگ پانی کی تلاش میں دریا کی طرف جا رہے ہوں اور صرف ایک شخص ریگستان کی سمت جا رہا ہو تو وہ تنہا شخص سوائے باقر مہدی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔'' اتفاق سے باقر مہدی نے خود بھی اس سے ملتی جلتی بات اپنے ایک شعر میں کہی ہے:

دو چار تھے جو توڑ کے صحرا نکل گئے  
اک قافلہ سا دشت روایات ہی میں تھا

باقر صاحب سے ان کی بیگم خیر النسا مہدی اور ان کے دوست غنی بھائی کے سوا کسی کے بھی تعلقات متوازن نہیں رہے۔ ٹائمز آف انڈیا کے اپنے ایک انٹرویو میں باقر مہدی نے کہا تھا کہ میرے واحد دوست غنی بھائی ہیں۔ ویسے ان کے مداحوں میں مشہور کینیڈین شاعر یعقوب راہی کا نام سرفہرست ہے۔ جو نہ صرف ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں بلکہ آخری لمحوں تک ان کی خبرگیری بھی کرتے رہے۔ میرے مراسم بھی دوسروں کی طرح ان سے ناہموار ہی رہے۔ کبھی اکثر ملے، کبھی برسوں نہیں ملے۔ اس مختصر سے مضمون میں انھی آدھی ادھوری ملاقاتوں کے دھندلے نقوش کو تازہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی تھی۔ تاریخ اور دن اب یاد نہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ یہ ملاقات مکتبہ جامعہ (بمبئی) کے دفتر میں ہوئی تھی۔ غالباً یہ 1967-68 کی بات ہے۔ مکتبہ جامعہ کے منیجر شاہد علی خاں صاحب نے انجمن ترقی اردو (ہند) پنویل شاخ کے سکریٹری کی حیثیت سے میرا تعارف کرایا تھا۔ ظاہر ہے باقر صاحب کو انجمن ترقی اردو (ہند) سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ انھوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ صرف مصافحہ کر کے رہ گئے۔ میں ان دنوں بھنڈی بازار میں ایک ٹیوشن کرتا تھا۔ آتے جاتے کبھی مکتبہ جامعہ میں بھی جھانک لیتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ہر سنیچر کی شام کو شاعروں اور ادیبوں کا اچھا خاصا جمگھٹا رہتا تھا۔ باقر مہدی، ندا فاضلی، شہاب مالیرکوٹلوی، فضیل جعفری، یوسف ناظم، محمود چھاپرا، تصدیق سہاروی، زکریا شریف، انور خاں، مرزا عزیز جاوید وغیرہ مستقل شرکا میں تھے۔ کبھی کبھی سردار جعفری، ظ۔ انصاری، اختر الایمان، جاں نثار اختر، محافظ حیدر وغیرہ کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی تھی۔

میں بھی گاہے گاہے سنیچر کی اس محفل میں شریک ہونے لگا۔ اس وقت افسانہ نگاروں میں کرشن چندر اور شاعروں میں سردار جعفری میرے آئیڈیل تھے۔ ترقی پسند تحریک کی چمک دمک ماند پڑنے لگی تھی اور ادب میں جدیدیت کا بول بالا تھا۔ میں نیا نیا پنویل سے بمبئی میں وارد ہوا تھا۔ پنویل بمبئی سے ملحق ایک قصبہ ہے۔ وہاں کوئی ادبی ماحول نہیں تھا۔ میں نہ ترقی پسندی سے ٹھیک طرح واقف تھا نہ جدیدیت سے۔ لہٰذا مکتبہ جامعہ کی بیٹھکوں میں ہونے والی باتیں اور بحثیں میرے لیے خاصی حیرت افزا ہوا کرتی تھیں۔ میں دیکھتا تھا کہ وہاں ہونے والے مباحث میں باقر مہدی پیش پیش رہتے تھے۔ گفتگو میں وہ اردو اور انگریزی ادب کے حوالوں کی ایسی جھڑی لگا دیتے کہ مقابل کو چپ ہوتے ہی بنتی۔ اس پر مستزاد ان کے بے محابا قہقہے۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے پوچھ لیا: ''کہاں کہاں چھپتے ہو؟'' میں نے شاعر، شمع اور بلٹز کا نام لیا تو منہ پھیر لیا۔ مجھے سخت ندامت ہوئی۔

مکتبہ پر زیادہ تر ''شب خون''، ''آہنگ''، ''تحریک'' اور ''کتاب'' میں چھپنے والی تخلیقات پر بحثیں ہوتی تھیں۔ ان پرچوں میں جو افسانے چھپ رہے تھے خاص طور پر ''شب خون'' میں، وہ خالص جدید رنگ میں ڈوبے ہوتے

تھے۔ سریندر پرکاش کے دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم، ڈیتی ڑاں، تلقارس، بلراج مینرا کی کمپوزیشن سیریز، انور سجاد کی گائے، سنڈریلا اور کونپل جیسے تجریدی افسانوں کا چرچا زیادہ تھا۔ نئے لکھنے والوں میں قمر احسن، شوکت حیات اور حمید سہروردی کا ذکر ہونے لگا تھا۔ بمبئی کے افسانہ نگاروں میں انور خاں اور انور قمر کا نام نمایاں تھا۔ انور خاں اپنا مشہور تجریدی افسانہ، ''کووں سے ڈھکا آسمان'' لکھ چکے تھے اور مکتبۂ جامعہ کے شرکا میں نوجوان افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی لکھ رہا تھا۔ ہندی میں جدیدیت کی لہر اپنا کوئی خاص اثر چھوڑے بغیر معدوم ہو رہی تھی۔ وہاں تجریدی، علامتی اور استعاراتی افسانوں کی جگہ، سمانانتر کہانی نے لے لی تھی۔ ''ساریکا'' سمانانتر کہانی کا ترجمان تھا۔ ''نئی کہانیاں''، ''کہانی''، ''کہانی کار''، ''دھرم یگ'' اور ''گیانودے'' جیسے ادبی پرچے کوئی لیبل لگائے بغیر خوبصورت کہانیاں شائع کر رہے تھے۔ میری کہانیاں مذکورہ رسائل میں تواتر سے چھپ رہی تھیں۔ شاید اسی لیے میرے افسانوں پر تجریدیت کا اثر اتنا گہرا نہیں تھا، جتنا میرے معاصرین پر تھا۔ میرے افسانے باقر صاحب کی نظر میں شاید اس لیے بھی زیادہ معتبر نہیں تھے کہ وہ اس زمانے کے جدید افسانوں کی طرح علامت، استعارہ، تجریدیت اور ابہام کے زیوروں سے آراستہ نہیں تھے۔ انھی دنوں مکتبۂ جامعہ کی سنیچری محفل کے شرکا نے باقر مہدی اور فضیل جعفری کی ادارت میں ''اظہار'' نکالنے کا فیصلہ کیا۔ ہر شخص نے اپنی استعداد کے مطابق چندہ دیا۔ اظہار کی تیاری کے دوران حسب توقع باقر صاحب اور فضیل صاحب میں اختلاف ہو گیا۔ فضیل صاحب نے پہلے شمارے کے بعد ہی ''اظہار'' سے علاحدگی اختیار کر لی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت کم مدت میں ''اظہار'' نے ادبی صحافت میں اپنی ایک پہچان بنالی تھی مگر اپنی صحت کی خرابی اور مالی مشکلات کے سبب باقر صاحب نے پانچ شمارے نکالنے کے بعد ''اظہار'' بند کر دیا۔

1975 میں ایمرجنسی نافذ ہوئی۔ میں باقاعدگی سے مکتبہ جانے لگا تھا۔ وہاں باقر صاحب سے تقریباً ہر سنیچر کو ملاقات ہو جاتی تھی۔ اب باقر صاحب سے قدرے بے تکلفی بھی ہو گئی تھی۔ مکتبہ سے اٹھنے کے بعد اکثر شام کو مجگاؤں میں انھی کے مکان پر بیٹھک ہوتی تھی۔ کبھی ابراہیم نذیر (اظہار کے کاتب) کبھی ن۔الف۔ ناظر یا نشاط انور ساتھ ہوتے تھے۔ پانچ پانچ روپے چندہ کر کے، دیسی دارو کی بوتل منگوا لی جاتی اور شغل مے کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ تازہ ادبی صورت حال کے علاوہ باقر صاحب ایمرجنسی کے دوران ہونے والی گرفتاریوں، پولس کی زیادتیوں اور سنسرشپ کا ذکر کرتے اور ایمرجنسی کے خلاف سخت غم و غصے کا اظہار کرتے۔ اسی زمانے میں باقر صاحب کی ایک غزل اردو بلٹز میں چھپی تھی۔ جس کا مطلع تھا:

موسم دار و رسن آ پہنچا
پھر وہی دور کہن آ پہنچا

اگر چہ غزل میں ایمرجنسی کے خلاف کچھ نہیں تھا مگر 'موسم دار و رسن' والے استعارے کے سبب باقر صاحب اس اندیشے میں مبتلا ہو گئے کہ شاید اس غزل کے بہانے پولیس ان سے باز پرس کر سکتی ہے۔ ہمیں بھی کچھ کچھ اعتبار سا آنے لگا۔ حتیٰ کہ ایمرجنسی ختم ہو گئی اور کوئی باز پرس نہیں ہوئی۔ باقر صاحب ایمرجنسی کے خلاف باتیں تو کرتے تھے مگر اندر سے خوف زدہ بھی رہتے تھے۔ انھوں نے خود ایک جگہ اعتراف کیا ہے۔ ''میں سیاسی طور پر 'activist' بننا چاہتا تھا مگر نہیں بن سکا۔''

وہ 'activist' نہیں تھے مگر ان کے اندر 'activist' بننے کی تڑپ ضرور تھی۔ ہو سکتا ہے یہ خوف اسی کا نتیجہ رہا ہو۔ ان کا یہ شعر بھی غالباً اسی جذبے کی طرف اشارہ کرتا ہے:

ہم یولی سیس بن کے بہت جی چکے مگر
یارو! حسینؓ بن کے بھی مر جانا چاہیے

ایمرجنسی کے زمانے میں بیس نکاتی پروگرام سرکاری پالیسی کا ایک اہم ایجنڈا تھا۔ ذرائع ابلاغ اس پروگرام کی تشہیر کا ذریعہ تھے۔ ان دنوں میں ریڈیو کے لیے ڈرامے اور فیچر لکھا کرتا تھا۔ باقر صاحب کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ریڈیو پر لکھنا سرکاری پالیسی کی حمایت کرنے کے مترادف ہے۔ جب کہ میرے ڈراموں اور فیچروں میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ بہرحال میں ریڈیو کے لیے لکھتا رہا کیوں کہ وہ میری ضرورت تھی۔ آخر ایمرجنسی ختم ہوئی۔ کبھی نہ کبھی تو اسے ختم ہونا تھا۔ جوں ہی ایمرجنسی ختم ہوئی، پورے ملک کے طول و عرض میں ایمرجنسی کے خلاف جلسے جلوسوں کا جیسے سیلاب سا آ گیا۔

باقر صاحب نے بھی ''اظہار گروپ'' کے زیر اہتمام داؤد بھائی فضل بھائی ہال میں ایمرجنسی کے خلاف جلسہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ جلسے کی تیاری میں میں بھی ساتھ تھا لیکن جب جلسے میں پڑھنے اور بولنے والوں کی فہرست بنی تو اس میں میرا نام نہیں تھا۔ باقر صاحب نے میرا نام اس لیے شامل نہیں کیا کیونکہ میں ایمرجنسی کے دوران ریڈیو پر لکھتا تھا۔ مجھے جلسے میں نہ پڑھوانے کا اتنا ملال نہیں تھا جتنا اس بات کا کہ محض ریڈیو پر لکھنے کی پاداش میں مجھے قابل تعزیر قرار دے دیا گیا۔ میں جلسے میں شریک نہیں ہوا۔ بعد میں میں نے روزنامہ ''انقلاب'' میں ''کاغذی سورما'' کے عنوان سے ایک طنزیہ لکھا۔

چوٹ سیدھی تھی۔ باقر صاحب کو خفا ہونا ہی تھا وہ خفا ہو گئے۔ چار چھ مہینوں تک مجھ سے بات نہیں کی۔ سنیچر کو مکتبۂ جامعہ پر مجھے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتے تھے۔ ایک دن حیدرآباد کے ایک افسانہ نگار رشید انور آئے ہوئے تھے۔ شام کو دونوں شغل کے لیے گرانٹ روڈ کے اڈے پر جا رہے تھے۔ جاتے جاتے باقر صاحب اچانک میری طرف مڑے اور بولے۔ ''تم نہیں چلو گے؟'' میں تو گویا منتظر ہی تھا۔ فوراً ان کے ساتھ ہو لیا۔ ان کی خفگی دور ہو چکی تھی۔ یہ عجب

بات تھی کہ وہ میرے افسانے پسند نہیں کرتے تھے مگر ان کے گھر کے دروازے میرے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ جیسا کہ ان کی عادت تھی، اکثر وہ ملنے والوں کو رخصت کرتے ہوئے کہا کرتے تھے ''اب آپ سے ملاقات فلاں سال، یا فلاں مہینے میں ہوگی۔'' مجھ سے بھی کہتے تھے۔ میں مسکرا کر جواب دیتا تھا: ''ٹھیک ہے۔ مگر میری یادداشت ناقص ہے۔ بھول جاؤں تو معاف کر دیجیے گا۔''

ان سے ملتے ہوئے ہر بار ایک نئے تجربے کا سا احساس ہوتا تھا کیونکہ ان کے تیز و طرار فقروں کی بوچھار اور بلند بانگ قہقہوں کی یلغار میں عجیب تھرل ہوتا تھا۔ جیسے آپ کسی ماہر شمشیر زن کے مقابل کھڑے ہوں ہر گھڑی چوکس اور مستعد۔

''آجکل'' میں میرا ایک افسانہ ''انجام کار'' چھپا جس کا پس منظر ممبئی کی ایک جھوپڑا بستی قصائی واڑہ سے متعلق تھا۔ ان دنوں میں اسی محلے میں رہتا تھا۔ ہندی میں جب یہ افسانہ چھپا تو مجھے کئی توصیفی خطوط ملے مگر اردو میں کسی نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ حسب معمول باقر صاحب کو بھی افسانہ پسند نہیں آیا۔ بلکہ انھوں نے اس پر کئی طرح کے اعتراضات کیے۔ 1975 کے افسانہ سیمینار میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اسی افسانے کا سیر حاصل تجزیہ پیش کیا جو نیا اردو افسانہ کے انتخاب میں شامل ہے۔ اس کے بعد تو اس افسانے کے بارے میں باقر صاحب کی رائے مزید خراب ہوگئی۔ باقر صاحب شہرت اور مقبولیت کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں۔ جو تخلیق جتنی مقبول ہوتی، باقر صاحب کی نظروں میں وہ اتنی ہی غیر معتبر قرار پاتی۔ سریندر پرکاش کا مشہور افسانہ ''بجوکا'' شائع ہوا تو چاروں طرف اس کا چرچا ہونے لگا۔ ایک ریڈیو ٹاک میں باقر صاحب کو ''بجوکا'' کا تجزیہ پیش کرنا تھا۔ باقر صاحب نے افسانے کے ایسے لتے لیے کہ سریندر پرکاش عرصے تک خفا رہے۔

باقر صاحب کے مزاج کی خوبیاں اور خامیاں رفتہ رفتہ مجھ پر آشکار ہونے لگی تھیں۔ باقر صاحب نے احتشام صاحب کے انتقال پر ایک مضمون نما خاکہ لکھا۔ ''ایک جواں برگد کی موت'' مضمون بہت اچھا تھا۔ انھوں نے اس میں احتشام صاحب سے بمبئی میں اپنی ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اس ملاقات میں کسی کتاب کے موضوع پر دونوں میں تکرار ہو جاتی ہے، بعد میں بیدی صاحب سچویشن کو سنبھال لیتے ہیں۔ احتشام صاحب کے چلے جانے کے بعد باقر صاحب نے بیدی صاحب سے پوچھا:

''آپ کی احتشام صاحب کے بارے میں کیا رائے ہے؟''

بیدی صاحب نے کہا: ''نہایت ثقہ آدمی ہیں مگر عالم......''

باقر صاحب بولے...... ''سردر صاحب بھی ایسے ہی ہیں۔ اصل میں سب اپنی اپنی شیروانیوں میں بند ہیں۔''

بیدی صاحب نے جملہ کاٹتے ہوئے کہا: ''اور میں اپنی داڑھی میں — اور میاں باقر! تم کب تک ننگی دوپہر میں زندہ رہوگے؟''

بیدی صاحب کے آخری جملے کی بلاغت سے میرے ذہن میں ایک جھما کا سا ہوا۔ ''ننگی دوپہر'' کے استعارے نے باقر صاحب کی شخصیت کے کئی گوشے روشن کر دیے۔ میں نے ان کی شخصیت کو مرکز میں رکھ کر ایک افسانہ لکھا ''ننگی دوپہر کا سپاہی۔'' یہ افسانہ ''شب خون'' میں چھپا تھا۔ یہ میرا پہلا تجریدی افسانہ تھا۔ اس میں ایک جگہ افسانے کا مرکزی کردار کہتا ہے۔ ''ہاں میں نے علم کو شراب کی طرح پیا ہے اور کتابوں کو کاکروچ کی طرح چاٹا ہے۔'' میں اس افسانے پر باقر صاحب کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ اگرچہ میں جانتا تھا جو وہ کہیں گے جواب میں، تاہم میں نے ایک دن ڈرتے جھجکتے پوچھ ہی لیا:

''باقر صاحب! تازہ ''شب خون'' میں میرا افسانہ چھپا ہے......''

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی انھوں نے کہا:

''ہاں پڑھا ہے۔ مجھے پسند نہیں آیا — مگر تم کتابوں کے اس قدر دشمن کیوں ہو؟''

میں ہنس دیا۔ مجھے اطمینان ہوگیا کہ افسانے کی ترسیل ہو چکی ہے۔

1977 میں میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ننگی دوپہر کا سپاہی'' چھپ گیا۔ اگرچہ میں کتاب پر جلسہ کروانے کے حق میں نہیں تھا۔ مگر اظہار گروپ کے کنوینر محمود چھاپرا کے اصرار پر ہامی بھر دی۔ جلسہ محمود چھاپرا کے مکان پر ہوا۔ جلسے میں باقر مہدی، سریندر پرکاش، فضیل جعفری، عزیز قیسی کے علاوہ انور خاں حفیظ آتش، مشتاق مومن، جاوید ناصر وغیرہ بھی موجود تھے۔ جلسے کی صدارت کے لیے سریندر پرکاش کا نام تجویز ہوا۔ جلسے کی تفصیل تو اب یاد نہیں مگر باقر صاحب کی تقریر کی دو ایک باتیں یاد ہیں۔ تقریر کا آغاز ہی اس جملے سے ہوا۔

''سلام کو چاہیے کہ اس کتاب کو بھول جائے۔'' پھر کئی افسانوں کا پوسٹ مارٹم کرتے رہے۔ آخر میں ''انجام کار'' کے تعلق سے اپنا موقف دوہرایا۔ ''اس کہانی کا مرکزی کردار دارو کے اڈے پر سرینڈر ہو جاتا ہے جس سے افسانہ کمزور ہو گیا ہے۔''

سریندر پرکاش نے اپنی صدارتی تقریر میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا: ''سلام کے افسانے کا ہیرو ایک عام آدمی ہے۔ وہ ہم اور آپ بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ کسی اسٹنٹ فلم کا ہیرو نہیں ہے کہ دارو کے اڈے پر جا کر سب کی ایسی تیسی کر دے۔ سلام کے افسانے کا انجام بالکل فطری ہے۔ مجھے افسانہ پسند ہے۔''

مجھے یاد ہے اس کے سال دو سال بعد ایک دن اچانک باقر صاحب ابراہیم نذیر کے ساتھ قصائی واڑہ میرے گھر آئے تھے۔ باقر صاحب کو دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم واپس ہونے لگے تو باہر گندگی کے ڈھیر، بجبجاتے گٹروں اور بہتی نالیوں کو دیکھ کر باقر صاحب ناک پر رومال

رکھتے ہوئے بولے۔

''داوارے دادا..... ترقی پسندوں کو سائبیریا بھیجنے کی بجائے یہاں بھیجنا چاہیے۔'' ابراہیم نذیر نے برجستہ یاد دلایا، ''باقر صاحب! ''انجام کار'' جیسا افسانہ یہاں رہ کر ہی لکھا جا سکتا تھا۔'' باقر صاحب ایک لمبی 'ہوں' کے ساتھ خاموش ہو گئے تھے۔

1980 کے آس پاس مکتبہ جامعہ کے منیجر شاہد بھائی (شاہد علی خاں) جنرل منیجر بنا کر دلی بھیج دیے گئے۔ باقر صاحب اپنا مجگاؤں والا مکان فروخت کر کے کارٹر روڈ باندرہ میں منتقل ہو گئے۔ دھیرے دھیرے مکتبہ جامعہ کی سنیچری محفلوں کی رونق کم ہوتی گئی۔ باقر صاحب سے بھی اب ملاقاتیں کم کم ہونے لگیں۔ وہ اب مکتبہ جامعہ نہیں آتے تھے، ملنے والے خود کبھی کبھی ان کے گھر باندرہ چلے جاتے تھے۔ ان کی صحت بھی اب ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ باقر صاحب کی ایک اور تقریر یاد آ رہی ہے۔

1988 میں میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ''معتبر'' شائع ہوا۔ انور خاں کے ساتھ دیگر احباب نے مل کر عبدالاحد ساز کے مکان پر ایک جلسے کا انعقاد کیا۔ انور خاں نے پتا نہیں کس طرح باقر صاحب کو صدارت کے لیے راضی کر لیا۔ باقر صاحب کی رضامندی پر مجھے خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی۔ لیکن جلسے میں ان کی صدارتی تقریر سننے کے بعد نہ خوشی باقی رہی نہ حیرت۔ بلکہ سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا۔ کیا تقریر ایسی بھی ہو سکتی ہے؟ جلسے کے آغاز میں ہی انھوں نے اعلان کر دیا کہ طبیعت کی ناسازی کے سبب وہ اپنی صدارتی تقریر پہلے ہی کر دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کتاب ہاتھ میں لے کر تقریر شروع کی۔ عجیب و غریب تقریر تھی۔ وہ کتاب کے اوراق الٹتے ہوئے ہر افسانے پر ایک آدھ فقرا چست کر کے آگے بڑھ جاتے۔

''ندی..... تمثیل ناکام ہے.....''

''درمیانی صنف کے سورما..... استعارہ بن نہیں پایا۔''

دست بریدہ لوگ..... کمزور ہے۔''

''کام دھنو..... پچاس فیصدی اچھا ہے۔''

''معتبر..... چالیس فیصدی۔''

''خصی..... تیس فیصدی۔''

آخری ریمارک..... ''سلام بن رزاق کا یہ مجموعہ ان کے پہلے مجموعے سے زیادہ کمزور ہے۔

اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

اور اٹھ کر چلے گئے۔ بعد میں یوسف ناظم صاحب کی صدارت میں جلسہ جاری رہا۔

انور خاں، انور قمر، مشتاق مومن، آتما رام، عنایت اختر، سعید راہی اور اسلم خاں وغیرہ نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ باقر صاحب کی تقریر پر سامعین میں سے بعض نے اعتراضات کیے مگر باقر صاحب تقریر کر کے جا چکے تھے۔

مجھے ان کی تقریر پر کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ میرے افسانوں کے بارے میں وہ اس قسم کی رائے پہلے بھی دیتے رہے تھے۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد پھوٹ پڑنے والے فسادات اور پھر بمبئی بم دھماکوں کے دوران بمبئی میں عجیب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ادبی محفلیں موقوف ہو چکی تھیں۔ احباب کا آپس میں ملنا ملانا بھی کم ہو گیا تھا۔ البتہ فون پر ایک دوسرے کی خیریت معلوم کر لیتے تھے۔ اس دوران میں نے فون پر دو ایک بار باقر صاحب اور خیری آپا کی خیریت دریافت کی تھی۔ بم دھماکے کو چار پانچ مہینے گزر چکے تھے۔ ممبئی کے حالات دھیرے دھیرے معمول پر آ رہے تھے۔ ایک دن اچانک باقر صاحب کا فون آیا۔ ان کا شعری انتخاب ''سیاہ رسیاہ'' چھپ گیا تھا۔ مجھے دینا چاہتے تھے۔ ویسے بھی ان سے ملے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ میں شام کو گھر پہنچ گیا۔ انتظار ہی کر رہے تھے۔ بہت اچھے موڈ میں تھے۔ بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پرانی باتیں یاد کر کے قہقہے لگا رہے تھے۔ بابری مسجد کے انہدام، فسادات اور اس کے بعد بم دھماکے کو لے کر بہت ڈسٹرب تھے۔ ''سیاہ رسیاہ'' کا ایک نسخہ دستخط کر کے دیا۔

میں نے کہا..... ''میں اس پر تبصرہ کروں گا۔''

بولے..... ''بالکل نہیں.....''

میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا: ''اگر آپ منع کرتے ہیں تو نہیں کروں گا۔''

شام ہونے لگی تھی۔ میں نے اجازت چاہی۔ کہنے لگے۔ ''مجھے ڈاکٹر نے منع کیا ہے مگر تم دو ایک پیگ لے سکتے ہو'' میں نے منع کرنا چاہا۔ مگر وہ نہیں مانے۔ بلکہ خیری آپا سے کہا:

''خیری! سلام کھانا کھا کر جائیں گے۔''

میں نے ان کے ساتھ بیسیوں بار شراب پی ہے اور کھانا کھایا ہے۔ مگر اس روز ان کے اس شفقت آمیز رویے نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔

اگرچہ یہ سچ ہے کہ وہ ایک ناہموار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ کب کس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے، کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ بہت معمولی سی بات سے خوش ہو جاتے تھے اور اس سے بھی زیادہ معمولی بات پر خفا ہوتے تھے۔ ان کی شخصیت اجتماع ضدین کا نادر نمونہ تھی۔ ایمرجنسی کے زمانے میں اپنے دیرینہ دوست قاضی سلیم کو اس لیے گھر سے نکال دیا تھا کہ وہ کانگریس کے حامی تھے۔ قاضی سلیم ان دنوں مہاراشٹر اسمبلی میں ایم.ایل.سی. تھے۔ ممبئی میں جن تین چار لوگوں سے ان کے مراسم ٹھیک ٹھاک تھے، ان میں الیاس شوقی کا نام بھی شامل ہے۔ الیاس شوقی نے ان کی دو تین کتابیں بھی چھاپی ہیں۔ ایک دن باقر صاحب کو پتا چلا کہ الیاس شوقی کے آٹھ بچے ہیں تو بہت خفا ہوئے۔ ''داوارے دادا!

استنے بچے۔'' اور انھیں اپنے گھر آنے سے منع کر دیا۔ (باقر صاحب لاولد تھے۔)

انور خاں ایک عرصے تک ان سے بے حد قریب رہے ہیں مگر ایک دن ان پر اس لیے خفا ہو گئے کہ انھوں نے ایران میں قائم ہونے والی اسلامی طرز حکومت کی تعریف کر دی تھی۔ بولے ''تم ایک بنیاد پرست حکومت کی تعریف کرتے ہو۔ تم میں اور تمھاری بہن میں بس یہی فرق ہے کہ وہ برقعہ پہنتی ہے اور تم برقعہ نہیں پہنتے۔''

انور خاں کو باقر صاحب سے ایسے سخت ریمارک کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایک عرصے تک ان سے ملنے نہیں گئے۔

یعقوب راہی ان کے قریب ترین لوگوں میں سے ہیں۔ ایک مدت سے باقر صاحب نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ مگر یعقوب راہی ان سے برابر ملتے رہتے تھے۔ ایک بار کسی بات پر بحث کے دوران ان سے کہہ دیا۔ ''تم ہر ہفتہ مجھ سے ملتے ہو۔ مگر تم مطالعہ نہیں کرتے۔ آئندہ کوئی نئی کتاب پڑھنے کے بعد ہی مجھ سے ملنا۔''

بادی النظر میں ان سارے واقعات سے بدسلوکی بلکہ سفّا کی جھلکتی نظر آتی ہے مگر شاید پس پردہ نیت 'اصلاح' کی بھی ہو سکتی ہے۔ چونکہ دوٹوک گفتگو ان کے مزاج کا خاصہ تھا لہٰذا وہ پھوڑے پر مرہم رکھنے کی بجائے سیدھے نشتر لگاتے تھے۔

مرحوم ظ۔ انصاری نے ان کے بارے میں کیسی سچے کی بات کہی ہے:

''جب بھی ... قلم سے کوئی اچھی اور اوریجنل بات نکلتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ باقر کو دکھاؤں۔ کیونکہ وہ سان ہیں جس پر چڑھائے بغیر چاقو کی دھار چلی جاتی ہے۔''

آج میں بھی اپنے افسانوں کے تعلق سے ان کی تشدد پسندی پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ میرے افسانوں میں اگر خوبی کی کوئی بات پیدا ہو سکی ہے تو ممکن ہے اس کی وجہ یہی ہو کہ میرے افسانے ہمیشہ ان کی سان پر چڑھتے رہتے تھے۔

اگرچہ میں نے ان سے کبھی اصلاح نہیں لی مگر ان کی تنقید کا تازیانہ کھا کر میرا شہب قلم شاید زیادہ چوکس ہو جاتا تھا اور لاشعوری طور پر میں خود احتسابی کے عمل سے دوچار ہوتا تھا۔

ایک عرصے سے ان کی صحت خراب چل رہی تھی۔ کئی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا۔ موت سے تین سال پہلے اچانک ان کی قوت گویائی چلی گئی۔ یہ بہت [illegible] ساتھ تھے [illegible] پہلے تک یعقوب راہی کے ساتھ ملنے گئے۔ تپاک سے ملے۔ [illegible] پوچھتے رہے۔ [illegible] تھے۔ [illegible] بیٹھے تھے۔ واپس لوٹ گئے تھے۔ [illegible] تک [illegible] دیتی تھیں۔ ایک [illegible] اور [illegible] میں [illegible]

گئے تھے۔ بیماری نے انھیں دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا۔ مگر سب سے زیادہ تکلیف دہ صورتِ حال یہ تھی کہ بات نہیں کر سکتے تھے۔ صرف اشاروں میں بچوں کی طرح غوں غاں کی آواز نکال کر مافی الضمیر سمجھانے کی کوشش کرتے، نہیں سمجھا پاتے تو ٹوٹی پھوٹی تحریر میں پرزے پر لکھ دیتے۔ یہ خیال ہی کس قدر مضطرب کر دینے والا تھا کہ وہ شخص جو کبھی اچھے اچھوں کی بولتی بند کر دیتا تھا، آج خود بولنے سے قاصر ہے۔ یادداشت اب بھی قابل رشک تھی۔ انھیں پرانی سے پرانی بات یاد تھی۔ انھوں نے غذا تقریباً ترک کر دی تھی، چونکہ دانت بالکل نہیں تھے اس لیے دونوں وقت ہوٹل سے 'اڈلی' منگا کر کھا لیتے تھے۔ کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ دوالینا ایک عرصہ ہوا بند کر دیا تھا۔

خیری آپا کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ تھی۔ اگر اتفاق سے باہر کہیں نظر آ جاتیں تو پہچاننا مشکل تھا۔ گھر کی چھت کھمبوں پر ٹکی تھی اور چھت سے جالے لٹک رہے تھے۔ گھر کا سامان کباڑ کی طرح بکھرا پڑا تھا۔ الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں مگر ان پر دھول جمنے لگی تھی۔ اس کے بعد بھی دو ایک بار ان کی عیادت کے لیے جانے کا اتفاق ہوا۔ آخری ملاقات انتقال سے ایک مہینہ پہلے ہوئی تھی۔ اس قدر لاغر ہو گئے تھے کہ بیڈ روم سے ڈرائنگ روم میں سہارا دے کر لانا پڑا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا ہڈیوں پر صرف چمڑا مڑھا ہوا ہے۔ آخر چوبیس ستمبر 2006 کو صبح ساڑھے چھ بجے یعقوب راہی کا فون آیا کہ ''باقر صاحب نہیں رہے۔'' رحمت آباد (مجگاؤں) کے قبرستان میں ان کی مٹھی بھر ہڈیوں کو دفن کر دیا گیا۔ میت میں وہی گنتی کے چند احباب تھے جن سے ان کے تعلقات بنتے بگڑتے رہتے تھے۔

انھوں نے ایک بار کہا تھا: ''میری شاعری کو تجرباتی اور تنقید کو Reactionary کہہ کر جھلایا جا سکتا ہے۔ مگر میری شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

علامہ اقبال کی مشہور نظم جبریل و ابلیس میں ابلیس کہتا ہے:

''میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح'' باقر صاحب کو بھی ابلیس کی یہی صفت پسند تھی۔ اپنے بارے میں خود کہتے ہیں:

بس میرا ذکر آتے ہی محفل اجڑ گئی
شیطان کے بعد دوسری شہرت مل گئی

وہ ذہنوں میں خوشبو بن کر نہیں دلوں میں نشتر بن کر زندہ رہنا چاہتے تھے اور وہ اپنے اس ارادے میں پوری طرح کامیاب رہے۔

❑❑❑

رابطہ:
13/9, L.I.G. Colony
Kurla (W), Mumbai-400070

ترتیب: فیروز عالم

# باقر مہدی معاصرین کی نظر میں

**مجتبیٰ حسین:**

باقر مہدی کا گزر جانا ایک شعلے کے بجھ جانے کا عمل نہیں ہے بلکہ ایک زندہ آتش فشاں کے خاموش ہو جانے کا نام ہے۔ پچھلے ڈیڑھ دو برس کے عرصے میں اس آتش فشاں کے خاموش ہو جانے کا لگاتار دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ 12 مارچ 2005 کو ممبئی کے باندرہ علاقے کے روی درشن اپارٹمنٹ میں واقع ان کے فلیٹ میں ہماری ان سے ملاقات ہوئی تھی اور ہم انھیں دیکھ کر ہکابکا رہ گئے تھے۔ ان کے چہرے پر فالج کا اثر تھا اور کسی طرح یہ بات ہمارے گلے سے نہیں اتر رہی تھی کہ جو شخص اپنے تیز، طرار، ذہین، چست اور بلند بانگ فقروں سے محفلوں کو گرما دیتا تھا، وہ اپنی زبان سے نہیں بلکہ اپنے حلق سے صرف چند ناقابل فہم آوازیں ادا کرنے کے قابل رہ گیا ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے باقر مہدی کی زبان پر تالا لگ گیا ہو۔ باقر مہدی کا سب سے بڑا ہتھیار خود ان کی زبان تھی۔ جب وہ زبان تیز اور طرار جملے ادا کرنے کے قابل نہیں رہ گئی تو یوں لگا جیسے باقر مہدی بالکل نہتے، بے بس اور مجبور ہو گئے ہیں۔ ان کی وہ زبان جو مشین کی طرح چلا کرتی تھی، گمنام آوازوں کے جنگل میں کھو گئی تھی۔ کمزور بہت ہو گئے تھے لیکن چال پھر لیتے تھے۔ ان کا توانا حافظہ بھی قائم، دائم تھا۔ اس آتش فشاں میں یقیناً اندر ہی اندر آگ بھی دہک رہی ہوگی۔ ان کے وجود کا الاؤ جل رہا ہوگا لیکن ان کی زبان آگ کے جن شعلوں کو ان کے وجود سے باہر پرکایا کرتی تھی، وہ لڑکھڑانے لگی تھی اور شعلے اندر ہی اندر ان کی ذات میں بجھنے لگے تھے۔ ان کے اس شدید کرب کو ہم نے اس وقت محسوس کیا جب ملاقات کے بعد ہم نے جانے کی اجازت مانگی تو وہ اچانک گلے سے لپٹ گئے اور بے ساختہ رونے لگے۔ ان کے حلق سے کچھ نامانوس سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ پتہ نہیں کون سی زبان میں جملے ادا کر رہے تھے۔ کاش کہ ہمارے کان اس زبان سے آشنا ہوتے۔ ہمیں یقین تھا کہ باقر مہدی سے ہماری یہ آخری ملاقات ہوگی اور چار دنوں کو مجید ہمارے مراسم کا یہ ڈراپ سین بھی ہوگا کیونکہ ہم نے کبھی باقر مہدی کو روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی ان کی قوت ارادی کی داد دیجیے کہ جینے کی آرزو میں نہتے اور مجبور باقر مہدی پورے ڈیڑھ برس تک موت سے نبرد آزما رہے۔

باقر مہدی ہمیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ باقر مہدی کس کو پسند اور کس کو ناپسند کرتے ہیں، اس کا پتہ چلانا بڑا دشوار ہے۔ خود باقر مہدی کو بھی غالباً اس کا پتہ نہیں چل پاتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اپنی سیماب صفتی کے باعث وہ کسی کو پسند کرتے کرتے اچانک ناپسند کرنے لگ جاتے تھے اور جب کوئی ان کے لیے ناپسندیدہ شخص بن جاتا تھا تو اسے کبھی پسندیدہ بننے نہیں دیتے تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ہم سے بھی ناراض اور خفا ہو جائیں گے کیونکہ ناراض ہونے کے معاملہ میں وہ اتنے خود مکتفی ہو چکے تھے کہ کسی سبب کے بغیر ہی ہر کس و ناکس سے خواہ مخواہ ہی ناراض ہو جانے کی صلاحیت اپنے میں پیدا کر چکے تھے۔ ہم ان سے یوسف ناظم اور عزیز قیسی کی معرفت قریب ہوئے تھے۔ بعد میں یہ اللہ کے فضل سے دونوں سے بھی ناراض ہو گئے۔ اس صورت حال سے ہمیں بڑی الجھن ہوتی تھی، البتہ یوسف ناظم اور عزیز قیسی اس صورت حال کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور باقر مہدی کے حوالے سے اسے ''بمبئی کا معمول'' قرار دیتے تھے بلکہ اس صورت حال کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے تھے۔ عزیز قیسی اور اختر الایمان دونوں ہی ان کے قریب ترین پڑوسی تھے لیکن جب ان دونوں سے ناراض ہوئے تو صبح کی چہل قدمی کے دوران جب بھی ان حضرات سے آمنا سامنا ہو جاتا تو فوراً اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتے تھے۔ اس صورت حال سے عزیز قیسی بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ ایک دن ہم اور عزیز قیسی سمندر کے کنارے صبح میں چہل قدمی کو نکلے تو سامنے سے باقر مہدی آتے دکھائی دیے۔ عزیز قیسی نے ہنستے ہوئے ہم سے کہا ''اب آئے گا مزہ۔ تم ذرا باقر مہدی کی حرکتوں پر نظر رکھو۔'' جیسے ہی ان سے سامنا ہونے کی نوبت آئی، انھوں نے فوراً اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ہمیں اچانک یوم جمہوریہ کی فوجی پریڈ یاد آگئی جس میں کسی فوجی دستے کا کمانڈر جیسے ہی صدر جمہوریہ کے ''سلامی شہ نشین'' کے سامنے پہنچتا ہے، کمانڈر اور دستے کے جوان ایک میکانیکی عمل کے ساتھ اپنے اپنے منہ سلامی شہ نشین کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ ہم نے چپکے سے عزیز قیسی سے کہا ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ باندرہ کے ساحل پر ہر روز 26 جنوری کی پریڈ ہوتی ہے۔'' عزیز قیسی نے اس غیر متوقع تشبیہ پر زوردار قہقہہ لگایا تو ''کمانڈر'' نے غصہ سے ہمیں پلٹ کر دیکھا۔ باقر مہدی میں جہاں سرکشی اور بیباکی تھی وہیں ایک نامانوس معصومیت بھی تھی۔

وہ جذبات سے کہیں زیادہ ''وفور جذبات'' کے آدمی تھے۔ بھرپور اور سرگرم زندگی جینے کی آرزو میں بسا اوقات ان کا جذبہ تو پیچھے رہ جاتا اور وہ خود

جذبے سے آگے نکل جاتے تھے۔ یہی ان کے جینے کی ادا تھی۔ زندگی بھر وہ کتابوں اور رسالوں میں گھرے رہے۔ پڑھنا لکھنا ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اردو میں ایسا وسیع المطالعہ شخص شاید ہی کوئی اور ہوگا۔ نہ صرف اردو بلکہ دنیا کی کئی بڑی زبانوں کے ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ پتہ نہیں اتنا فالتو علم ان کے کس کام آتا تھا۔ وہ شاعر تھے، نقاد تھے، دانشور تھے اور مدیر بھی تھے۔ شاعر تو جیسے بھی وہ تھے، آپ جانتے ہیں۔ ہم انھیں بحیثیت نقاد زیادہ پسند کرتے تھے۔ بے لاگ، بے باک اور مصلحتوں سے بے نیاز۔ زبان اگرچہ اکھڑی اکھڑی اور اَٹ پٹی سی لکھتے تھے (غالباً یہ ان کے مزاج کی آئینہ دار تھی) البتہ بات پتے کی اور وزن دار کہتے تھے۔ رسالہ ''اظہار'' کے مدیر کی حیثیت سے بھی انھوں نے کئی ادبی مباحث کو چھیڑا۔ دانشور بھی وہ بہت بڑے تھے البتہ دانشوری میں جب تک اپنی شرارت کی ملاوٹ نہیں کر لیتے تھے، تب تک انھیں چین نہ آتا تھا۔ انھوں نے ہر ایک سے معرکہ آرائی کی چاہے وہ سردار جعفری ہوں یا کیفی اعظمی، ظ۔ انصاری ہوں یا اختر الایمان، کرشن چندر ہوں، یوسف ناظم ہوں یا عزیز قیسی۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ جن جن سے ان کی معرکہ آرائی ہوتی تھی، انھیں وہ اندر ہی اندر دل و جان سے چاہتے بھی تھے۔ یہی تو باقر مہدی کی انفرادیت تھی۔

یہ سچ ہے کہ باقر مہدی کبھی ہم سے ناراض نہیں ہوئے لیکن اس بات کو ہم کوئی اعزاز نہیں بلکہ اپنی بے بضاعتی اور نااہلی پر محمول کرتے ہیں۔ ہم میں ہی کوئی کوتاہی ضرور ایسی تھی جس کے باعث باقر مہدی نے ہمیں اپنی ناراضگی کا اہل نہیں جانا۔ اب وہ بھلا ہم سے کیا ناراض ہوں گے، کیونکہ وہ تو سالم دنیا ہی سے ناراض ہوکر بہت دور نکل گئے ہیں:

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

**یعقوب راہی:**

باقر مہدی، اودھ (یو۔ پی۔) کے قصبہ ردولی میں ایک خوشحال، تعلیم یافتہ زمیندار شیعہ مذہبی گھرانے میں 11 فروری 1927 (تصدیق کردہ تاریخ پیدائش) کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد بزرگوار جعفر مہدی (رزم ردولوی) بھی شعر و سخن سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے، ان کی سوتیلی والدہ (کہ ان کی حقیقی والدۂ محترمہ ان کے بچپن ہی میں، چھوٹی بہن ناہید کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ہی وفات پا چکی تھیں) بھی شعر کہا کرتی تھیں اور ان کے قریبی اعزا بھی— اس اعتبار سے انھیں شعر و ادب کا ذوق ورثے ہی میں ملا، خود انھوں نے بھی اپنے ہمہ جہت مطالعے سے اسے مزید پروان چڑھایا۔ اور بقول ظ۔ انصاری خود کو ایک ایسی ''سان'' بنایا' جس پر چڑھائے بغیر چاقو کی دھار چلی جاتی ہے۔ ان کے الفاظ میں:

''جب بھی قلم سے کوئی اچھی اور اوریجنل بات نکلتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ باقر کو دکھاؤں...... جس طرح سان سخت، کھردری، تیز اور کٹیلی ہوتی ہے۔ اسی طرح باقر مہدی بھی سخت، تیز اور کٹیلے ہیں اور ان کے وجود نے ہماری زندگی کی ایک بہت بڑی کمی پوری کر دی ہے۔''

باقر مہدی اپنے خاندان سے ملی زمیندارانہ مذہبی آدابِ زندگی کی معینہ اقدار سے اوائل عمر ہی میں بدظن و متنفر ہو چکے تھے۔ یہ الگ بات کہ ان کی بیگم خیر النسا مہدی ان کے ساتھ گزاری اپنی ہم سفری کے چالیس/ پینتالیس سالہ نقوش اجاگر کرتے ہوئے، ان کے تعلق سے کچھ اور ہی خیال کا اظہار کر چکی ہیں:

''باقر مجھ سے لاکھ کہیں کہ وہ جاگیردارانہ ماحول سے نکل کر آئے ہیں اور اپنے آپ کو آزاد خیال، انقلابی اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں اور ان باتوں میں چاہے تھوڑی بہت حقیقت بھی ہو تاہم میرا خیال ہے کہ اب بھی ان میں جاگیردارانہ ماحول کے خراب اور اچھے جراثیم پائے جاتے ہیں۔''

باقر مہدی کی ابتدائی تعلیم ان کے اپنے قصبہ ردولی، لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ کے لیے انھوں نے اگست 1945 میں علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں سے انٹرمیڈیٹ (جغرافیہ کے ساتھ) اور بی۔اے۔ (فلسفہ کے ساتھ) پاس (مئی 1949) کر کے وہ ایم۔اے۔ کے لیے پھر لکھنؤ لوٹ آئے۔ چاہتے تو وہ بڑی آسانی سے اردو/فارسی میں ایم۔اے۔ کر کے خود علی گڑھ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو/فارسی بننے کی منصوبہ بندی کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے معاشیات و عمرانیات میں ایم۔اے۔ کرنے اور اس وقت کے برصغیر کے مشہور ترقی پسند مارکسی دانشور، بنگالی زبان کے ادیب ڈی۔ پی۔ مکھرجی سے مستفید ہونے کی ٹھانی۔ معاشیات و عمرانیات کے ساتھ ایم۔اے۔ کر کے وہ اپنے جاگیردارانہ مذہبی خاندان گھر بار کے میسر سارے عیش و آرام چھوڑ' خاندانی جائداد سے قطع تعلق کر— اپنی پسند و مزاج کی کھلی آزاد زندگی گزارنے کے لیے مختلف (دہلی، پھر علی گڑھ) شہروں کی خاک چھانتے نکل پڑے۔ کسی مستقل ملازمت سے پرہیز کرتے کرتے ایک دن ظ۔ انصاری کا خط محمود سروش کے نام اور آل احمد سرور کا خط راجندر سنگھ بیدی کے نام تھامے دسمبر 1954 کے تیسرے ہفتے، شہر بمبئی میں آدھمکے ''بمبئی کی بزم آرائیاں'' کے مصنف جناب رفعت سروش کے مطابق:

''بمبئی کی ادبی زندگی میں ایک دھماکہ ہوا لکھنؤ سے باقر مہدی کی آمد۔ باقر خطرناک حد تک اپنے آپ سے بے پرواہ انسان ہیں۔ وہ ٹکسال میں سونے کی طرح کھرے انسان ہیں۔ جہاں چاہے ٹھونک بجالو۔ وہ ملازمت نہ کر کے زندہ رہنے میں کمال رکھتے ہیں اور لطف یہ کہ انھیں بمبئی کی فلمی زندگی کا

بھی شوق نہیں۔ پڑھنا اور لکھنا لکھنا اور پڑھنا اور اس شغل سے تھک گئے تو مکتبۂ جامعہ میں بیٹھ کر یاروں سے گپ لگانا باقر کے معمولات تھے اور اب بھی ہوں گے۔

ان کے معمولات تو خیر، اب بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ لیکن مکتبۂ جامعہ (بمبئی) میں بیٹھ کر یاروں سے گپ لگانے کے سلسلے کو ختم ہوئے قریب قریب بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ خود پسندی و خودنمائی کے سبب یہاں کی ادبی فضا ایسی مکدر ہوئی ہے کہ شاعروں، ادیبوں اور ادب نوازوں کے دلوں میں مل بیٹھنے کی خواہش ہی دم توڑ چکی ہے۔ اس سے قطع نظر، باقر مہدی جب ممبئی آئے، کچھ ماہ حضرت محمود سروش (مرحوم) کے مکان واقع وڈالا میں رہے۔ ان کی بیٹی معصوم (بیگم شمیم عباس) ان کی گود کی حدت جھیل چکی ہیں (اس کے بعد شاید ہی کوئی اور بچی ان کی گود چڑھی ہو کہ وہ تو کبھی افزائش نسل کے قائل ہی نہیں رہے) حضرت محمود سروش کے ساتھ رہتے رہتے، جاں نثار اختر، راجندر سنگھ بیدی، اختر الایمان، سردار جعفری جیسے مشاہیرِ شعر و ادب سے اپنے تعلقات بھی استوار کرتے رہے اور ان کے ہم وطن...... مکتبہ جامعہ کے اس وقت کے منیجر سراج الحق کے ذریعے پروفیسر عالی جعفری سے متعارف ہونے پر حسب ضرورت ٹیوشن بھی پاتے رہے، جس کے نتیجے میں مشہور فلمی شخصیت محبوب خاں کے بیٹے اقبال کو (بی۔اے۔ معاشیات) مہینوں، ہر ہفتہ چار دن، ٹیوشن دیتے رہے، نیشنل ہیرالڈ اور قومی آواز کے نمائندے ورما صاحب کے سونپے گئے کام کرتے رہے، رفتہ رفتہ ان کے حالات ''غنیمت'' ہوتے گئے۔ پھر مذکورہ سراج الحق صاحب ہی کی مدد سے بھنڈی بازار سے کچھ فاصلہ پر واقع آرکیڈیا بلڈنگ میں استاد خلیل کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ جناب رفعت سروش کے دیے گئے پروگرام کے تحت آل انڈیا ریڈیو کے لیے فیچر، ڈرامے لکھتے رہے حضرت علی سردار جعفری کے توسط سے شام لال (ادیب) سے کیا طے کہ ان سے دوستانہ تعلقات مستحکم کرنے کے لیے محترمی عالی جعفری کے فراہم کردہ یونیورسٹی لائبریری کارڈ کی صورت میں مختلف موضوعات پر متنوع کتابیں پڑھنے کے عادی ہو گئے۔ اسی دوران یونیورسٹی کے پاس واقع Walter-Thomson کے دفتر میں ایاز پیر بھائی سے ملاقات کیا ہوئی کہ انھوں نے سیلون ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگرام کے لیے دودھ کے ڈبے Lactogen کی تشہیر کے سلسلے میں ایک جملے پر مشتمل ایک Add لکھوایا اور باقر مہدی کی خوشحالی کا زمانہ شروع ہو گیا۔ اسی خوشی میں انھوں نے پہلی بار ''شراب'' چکھی اور رفتہ رفتہ اس کے عادی ہو گئے۔ بقول ان کے ''شرابی'' بن گئے۔ انھیں دنوں ڈاکٹر مسعود حسن خاں کی تشریف آوری پر پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (بوری بندر) میں ایک اعزازی نشست منعقد کرائی، جس میں انھوں نے اپنی ایک نئی غزل سنائی، جس کا یہ شعر:

تو کس طرح حیات کے معنی سمجھ گیا
میں زندگی کی راہ پہ آیا نہیں ہنوز

پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی نگرانی میں ''اردو میں طنز و مزاح'' اس موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کرنے والی ایک لڑکی خیر النسا خاں کو بہت پسند آیا۔ وہی لڑکی بعد میں ان کی شریک حیات خیر النسا مہدی بنی۔ محترمہ اپنے تھیسس کی تیاری/تکمیل کے لیے باقر مہدی سے ملیں، ملتی رہیں، مشورے لیتی رہیں۔ پی۔ایچ۔ڈی تو نہ کر سکیں، مگر اسی دوران باقر مہدی نے ان سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ پس و پیش کے بعد وہ شادی کے لیے راضی ہو گئیں کہ بقول باقر: ''وہ اپنے ماحول سے عاجز سی تھیں۔'' باقر مہدی کا پہلا شعری مجموعہ ''شہر آرزو'' نظیری شیرازی کے نام سے منسوب ہونے والا تھا مگر جب شائع ہوا تو خیری • خیر النسا) کے نام منسوب ہو گیا۔ باقر مہدی حسب معمول جگہ جگہ ٹیوشن دیتے رہے، انگریزی اردو شعر و ادب نیز دوسرے مضامین (معاشیات، عمرانیات، نفسیات، تعلیمات.....) کے ساتھ ساتھ فارسی زبان و ادب کا مطالعہ بھی کرنے لگے، ریڈیو کے لیے ڈرامے/فیچر لکھتے رہے، فری لانسنگ کرتے رہے، شعر سناتے رہے، بحث و مباحثہ میں شریک ہوتے رہے، مباحثوں کو جنم بھی دیتے رہے، مگر گھر گرہستی نہ ہونے کے سبب ہوٹلوں میں کھانا کھاتے رہے، جوں جوں ان کے معاشی حالات سدھرتے گئے، توں توں وہ آرکیڈیا بلڈنگ سے (1956 کے اواخر میں) کولابہ/کف پریڈ کے ایک گیسٹ ہاؤس اور پھر کچھ عرصے بعد British India Press (لیڈر پریس) کے کمپاؤنڈ میں ان کے ایک شاگرد کے توسط سے ایک کمرہ (جہاں ظ. انصاری اور بوہرہ کمیونٹی کے مذہبی سربراہ، حضرت سید برہان ماسکو منتقل ہونے سے پہلے رہا کرتے تھے) دلانے پر کولابہ سے مجگاؤں منتقل ہو گئے، جس کو وہ آج بھی اپنی کھولی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ 10 اکتوبر 1958 کو ان کی شادی مذکورہ سنی لڑکی، صوفیہ کالج کی فارسی لیکچرر محترمہ خیر النسا خاں سے ہو گئی، جس میں جاں نثار اختر، اختر الایمان، استاد خلیل اور دیگر مشہور اردو شعرا تو شریک ہوئے مگر کوئی شیعہ شریک نہ ہو سکا۔ ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا اور موصوف نے اپنے ہر معاملہ میں کفایت شعاری اختیار کر لی، مگر ان کے معمولات میں کوئی خاص تبدیلی نہ آسکی۔ رات کو دیر سے گھر آنے کی عادت چھوٹ جائے، اس مقصد سے خیری بھابی نے انھیں 65-1967 میں انگریزی ادبیات و جمالیات میں ایم۔اے۔ کرنے پر آمادہ کیا۔ انھوں نے ممبئی یونیورسٹی میں داخلہ بھی لیا۔ ایم۔اے۔ کی کلاس میں داخلے کے بعد موصوف صبح آٹھ بجے

سے شام آٹھ بجے تک یونیورسٹی لائبریری میں پڑھتے تو رہے، مگر امتحان نہ دے سکے۔ نہ ان کے خیال کے مطابق ایک ہی موضوع پر روز روز پڑھنا، پڑھانا اور صبح سے دو بجے تک نوکری کرنا، آدمی کو کولھو کا بیل بنا دیتا ہے اور وہ کولھو کا بیل بننا نہیں چاہتے تھے۔ خیری بھابی نہ صرف ان کے لیے مالی اعتبار سے ایک سہارا ثابت ہوئیں بلکہ ان کی دیکھ ریکھ انھیں ایک ''شیشۂ نازک'' سمجھ کر کرتی رہیں اور آج بھی وہ اپنی ذمہ داری بخوبی نبھا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں واقعی خوش قسمت ہیں باقر مہدی کہ خیری بھابی کی تمام تر قربانیوں کی بدولت وہ نہ صرف تباہ و تاراج اور مراٹھی زبان کے بوہیمین شاعر منوہر اوک کی صحبت میں چرس گانجے کی نذر ہونے سے بچ گئے بلکہ مجگاؤں کی اپنی ''کھولی'' چھوڑنے کے بعد بھی، وہ— خیری بھابی کے خریدے ان کے روی درشن، کارٹر روڈ، باندرہ میں واقع فلیٹ میں فراہم کردہ تمام تر سہولتوں کے ساتھ برابر حسب معمول پرورش لوح و قلم میں ہمہ تن مصروف و مشغول رہے— آج بھی اپنی عمر کے 78ویں سال میں اسی طرح متحرک و منہمک ہیں۔ اب کہیں گذشتہ ایک آدھ سال سے اچانک ''زبان کے فالج'' کی زد میں یوں آگئے ہیں کہ اپنے تیز، طرار، ذہین، چست اور بلند بانگ فقروں سے محفلوں کو گرما دینے والے باقر مہدی اپنی زبان سے نہیں، اپنے حلق سے بڑی حد تک ناقابل فہم آوازیں نکالتے ہیں— ان آوازوں کو سننے والا ان کی معنویت کو اگر نہ سمجھ پائے تو کاغذ پر اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنی بات سمجھاتے ہیں— طوتو لگتا ہے کہ موصوف زبان کے معاملے میں بالکل نہتے ہو گئے ہیں— تاہم مقام شکر ہے کہ ان کا غضبناک حافظہ اب بھی تیز ہے۔ ان کے ذہن میں ساری باتیں تر و تازہ ہیں— افسوس اس کا ہے کہ باقر مہدی کے جس گھر میں محفلیں برپا ہوا کرتی تھیں، اب وہاں ایک خاموش خاموش سی فضا چھائی ہوئی ہے اور اس کا قلق خیری بھابی کو اتنا شدید ہے کہ اس سلسلے میں وہ جب بھی فون رملنے پر بات کرتی ہیں، رونے لگتی ہیں— دل سے چاہتی ہیں کہ باقر مہدی کا ہر ممکن علاج کریں مگر موصوف نہ کسی ڈاکٹر رحکیم سے رجوع ہونے کے لیے راضی اور نہ کسی اسپتال میں داخل ہونے کے لیے— آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

**فضیل جعفری:**

باقر مہدی اردو ادب میں ایک اہم ریڈیکل نقاد اور شاعر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان میں اور ان کے دوسرے اہم نمائندہ جدید نقادوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ وہ محض ''تخلیق'' کو سو فیصدی اہمیت نہیں دیتے۔ بہ حیثیت نقاد وہ ادب کی خود مختاری اور سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے دوسرے علوم مثلاً معاشیات، عمرانیات اور سیاسیات سے ادب کے روابط کو یکسر رد نہیں کرتے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ انسانیت کی حفاظت کے لیے سرکش قوتوں کے ساتھ ادیب کے کمٹ منٹ پر بھی زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ممکن ہی نہیں کہ ادیب روزمرہ کے حالات نیز قومی اور بین الاقوامی سیاست سے قطعاً کنارہ کش ہو کر محض تخلیق کی دنیا میں گم ہو جائے۔ وہ اپنے اکثر مضامین میں سویت کمیونزم، سرمایہ داری اور صنعتی تہذیب پر یکساں انداز میں حملہ آور ہوتے ہیں۔ ویت نام پر چینی حملے کے بعد باقر کے لیے چینی کمیونزم میں فرق کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ یہ مسئلہ باقر مہدی ہی کا نہیں بلکہ ساری دنیا کے ریڈیکلز کا ہے— وہ ادبی اور فنی اقدار کو ہر طرح خود مکتفی نہیں سمجھتے۔ انھوں نے اپنی شاعری اور تنقید دونوں کو نعرہ بازی سے دور رکھتے ہوئے بھی اپنے سیاسی اور سماجی Conviction کے اظہار کے لیے ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس طرح باقر مہدی نے ادب میں اپنے لیے نہ صرف ایک رول کا انتخاب اور اس کا اعلان کیا ہے بلکہ اسے اپنی تحریروں میں نبھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ انھیں ایک طرف ان ترقی پسندوں سے شکایت ہے جنھوں نے اپنے انقلابی کردار کو ترک کر کے استحصالی نظام سے سمجھوتہ کر لیا ہے تو دوسری طرف وہ ان جدیدیوں سے بھی ناراض ہیں جو وابستگی اور ناوابستگی دونوں کو اپنی سہولتوں کے مطابق استعمال کرنے کے قائل ہیں۔ جب علی سردار جعفری باقر مہدی کے متعلق یہ لکھتے ہیں کہ: ''انھیں ترقی پسندوں کی کردار کشی پر معمور کیا گیا ہے۔'' تو وہ اس حقیقت کو قطعاً نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ان سے اور ان کے ''ساتھیوں'' سے باقر کی ناراضگی کسی نفرت، عداوت یا کسی ذاتی منفعت کی غرض سے نہیں بلکہ اس خفگی کے پیچھے ایک ذہنی کسک ہے..... بدلتے ہوئے حالات اور بدلتی ہوئی ادبی قدروں کا زیادہ تفصیلی اور زیادہ وسیع النظری سے مطالعہ کرنے کے سبب باقر مہدی کے خیالات میں بھی دھیرے دھیرے اور غیر محسوس سطح پر تبدیلیاں آتی گئیں..... باقر مہدی بھی جو ایک عرصے تک ''سرگوشی'' والی شاعری کے بجائے اقبال کے ''پر وقار لب و لہجہ اور بلند آواز'' کے قائل تھے، آخر شاعری میں داخلیت اور لہجے کی نرمی کی اہمیت کے معترف ہو گئے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ باقر بھی ہماشما کی طرح دیکھا دیکھی جدیدیت کی آواز میں آواز ملانے لگے..... باقر روزمرہ کی انسانی زندگی کے مسائل کی اہمیت اور ادب سے ان کے قریبی تعلق کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کرتے چلتے ہیں کہ حقیقی ادیب کسی ایک مسلک، کسی ایک پارٹی یا کسی ایک ادبی نظریے کا غلام بن کر نہیں جی سکتا۔ باقر کا رویہ آگے چل کر ادیب کے غیر مشروط ذہن اور اس کی انفرادی آزادی کے تعلق سے جدیدیت کی طرف سے ایک اہم مطالبے کی شکل میں سامنے آیا ہے..... باقر مہدی نقاد سے توقع کرتے ہیں کہ وہ ادب کو ایک سے زیادہ تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرے..... وہ ایسی تنقید کے قائل ہیں جو خود کو محدود کر لینے کے بجائے اپنی آغوش وا رکھے تاکہ نئے نکات اور نئے طریق کار کا ارتقا ہوتا رہے۔ وہ جدید ادیبوں سے خود جدیدیت کی حدود توڑنے کی توقع کرتے ہیں تاکہ روایت کی توسیع ہونے کے

بجائے نئی روایتوں کی بنیاد پڑ سکے— بہ حیثیت مجموعی باقر مہدی ادبی اور سیاسی ادعائیت Dogmatism کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں..... انھوں نے اپنا سارا زور (توازن کے برخلاف) روایتی موضوعات اور اقدار سے سرکشی پر ہی صرف کیا ہے اور لسانی نیز ہیئتی سرکشی کو سرے سے نظر انداز کیا ہے—(جب کہ) شاعروں کے شاعر اور نقادوں کے نقاد ٹی. ایس. ایلیٹ نے ہر زمانے کی جدید شاعری کے لیے یہ بات لازمی قرار دی ہے کہ شاعری کی زبان ایسی ہو جو پڑھنے والوں کو نہ صرف چونکائے بلکہ انھیں صدمہ (Shock) پہنچائے۔ انھوں نے ادب میں سرکش رجحانات اور شخصیتوں کو ابھارنے والے اپنے تنقیدی مشن میں نمایاں کامیابی شخصیت کا عکس دیکھتے ہیں..... باقر مہدی کا تنقیدی ذہن دھیرے دھیرے اور غیر محسوس طریقے پر جدید تجزیاتی تنقید کی طرف بڑھتا رہا ہے..... یہ تجزیاتی طرز تنقید جس سے جدید تنقید عبارت ہے باقر مہدی کے مضامین میں دن بدن نکھرتا گیا ہے۔''

## خیرالنسا مہدی:

''میرے شوہر جن کا اسم گرامی باقر مہدی ہے..... میری ان سے شادی کوئی رومانی حادثہ نہیں تھا بس ہم دونوں اپنے حالات سے بیزار تھے اس لیے ہم ایک ہو گئے۔ وہ کیا ہیں یہ بتانا تو خاصا دشوار ہے پھر بھی میری ناچیز رائے میں (بیویوں کی رائے اپنے شوہروں کے بارے میں اکثر ناچیز ہوتی ہے) لیکن ان کے بارے میں کوئی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ پائی ہوں۔ پتہ نہیں انھوں نے خفا ہو کر کہا تھا یا خوش ہو کر کہا تھا: ''میں تو مجموعۂ اضداد ہوں۔'' وہ تو آدمی کو یونانی فلسفیوں کی طرح ایک سماجی جانور بھی سمجھتے ہیں اور ہندوستانی فلسفہ کے مطابق خود کو مشترکہ تہذیب کا ایک نمائندہ بھی سمجھتے ہیں۔ وہ تنہائی کے بہت بڑے حامی ہیں کیونکہ اس طرح انھیں مطالعے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت مل جاتا ہے— شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی طالب علمانہ زندگی میں بقول خود ایک اوسط درجے کے طالب علم رہے تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے وہ زیادہ تر اپنا وقت مطالعے میں صرف کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے کہ ان کے بارے میں کوئی آخری رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ جو شخص تنہائی کو اتنی شدت سے پسند کرتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ احباب نوازی میں بھی پیش پیش رہتا ہو۔ ایسے آدمی کے بارے میں کیا رائے دی جا سکتی ہے؟ کیا وہ نیم شخصیت رکھتے ہیں یا ہشت پہلو ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ نہ کہنا چاہیے..... سجاد حیدر یلدرم نے کبھی کہا تھا: ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔'' مجھے نہیں معلوم کسی نے ان کو اپنے دوستوں سے بچایا یا نہیں لیکن باقر مہدی کو ضرور کتابوں کی یلغار نے ان کے دوستوں سے بچایا— یہ جان کر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جب ان کا کوئی دوست یا شناسا ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے وہ آہستہ آہستہ اس سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مگر یہ بھی ایک کلیہ نہیں ہے۔ شام لال، راجندر سنگھ بیدی، جاں نثار اختر، اختر الایمان، قاضی سلیم حتیٰ کہ مرزا عزیز جاوید تک سے وہ بڑی فراخ دلی سے ملتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر باقر مہدی سے ملنا ہو تو ان کے گھر پر ملو اس لیے کہ وہ خوش اخلاقی کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں اور سنا ہے کہ باہر کی دنیا میں وہ نہایت بے باک اور جری ہیں۔ پتا نہیں یہ بھی کہاں تک سچ ہے؟ اپنے جاننے والوں میں وہ سب سے زیادہ اہمیت دو اشخاص کو دیتے ہیں۔ ایک تو ٹائمس آف انڈیا کے شام لال اور دوسرے مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی— شام لال سے باقر مہدی ہفتے میں دو بار ملنے جایا کرتے تھے ایک منگل کی شام اور ایک جمعہ کی شام۔ یہی دونوں دن ہیں جب وہ صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں..... باقر مہدی کا کبھی نہ چھوڑنے میں شام لال کی شخصیت ہی کا دخل تھا ... ورنہ باقر کو کئی مواقع ایسے ملے جب وہ باہر کے ملکوں میں جا سکتے تھے۔ میرے اور اپنے حالات کو بہتر بنا سکتے تھے..... وہ ہمیشہ نئی کتابوں اور نئی فلموں کا ذکر ان کے یہاں سے لوٹ کر کرتے تھے۔ بے ریا تعلقات کی مثالیں تو مل جاتی ہیں جیسے سرسید اور حالی میں تھیں یا غالب اور شیفتہ کے درمیان تھیں۔ مگر باقر مہدی خود کو شام لال کے مقابلے میں نیم خواندہ سمجھتے تھے وہ کہتے تھے کہ میرے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ملک کا ایک اہم دانش ور مجھے ہر ہفتے دو بار ملنے کے لیے بلاتا ہے..... باقر ان سے کسی قسم کی توقع نہیں رکھتے تھے سوائے اس کے کہ عالمانہ گفتگو ہو..... باقر مہدی کہا کرتے تھے کہ آدمی کو ہمیشہ اپنے سے زیادہ ذہین اور بے باک عالمانہ شخص سے ملتے رہنا چاہیے جب ہی اس کی شخصیت کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا— باقر مہدی کے دوسرے دوست مشہور کہانی نگار راجندر سنگھ بیدی تھے..... وہ کہتے تھے: ''باقر نہ جانے کیوں تم سے مل کر بہت سکون حاصل ہوتا ہے۔ تم ہی وہ واحد شخص ہو جو مجھے کامیاب افسانہ نگار سمجھتے ہو ورنہ دنیا اور گھر والے تو مجھے ناکارہ سمجھتے ہیں۔'' بیدی کے چلے جانے کے بعد باقر اپنا منہ چھپا کر اتنا روتے کہ اس کا بیان میں نہیں کر سکتی— باقر کے تیسرے دوست جاں نثار اختر تھے جن سے باقر ممبئی آنے کے پہلے دن ہی ملے تھے..... پھر جب جاں نثار اختر آرکیڈیا بلڈنگ سے باندرہ چلے گئے تو ہمارے مراسم تقریباً ختم ہو گئے اور پھر سالہا سال بعد جب ساحر لدھیانوی کی اسیری سے رہا ہوئے تو ہم لوگوں کو ہمیشہ نئے سال کی رات گزارنے کے لیے بلاتے تھے۔ 18 اگست 1976 میں اختر صاحب کا انتقال ہوا..... میں اس محفل غم میں شریک تھی۔ عزاداروں میں محترمہ قرۃ العین حیدر بھی شریک تھیں اور مجھے ان کا یہ جملہ یاد رہا جو وہ اپنے برابر بیٹھی ہوئی خاتون سے پوچھ رہی تھیں کہ: ''ان میں باقر مہدی کی بیوی کون ہے؟''..... باقر مہدی زار و قطار رو رہے تھے۔ وہ رات ہمارے لیے بڑی کرب ناک تھی اور ہم اپنے نئے مکان روی درشن میں سو نہیں پائے تھے— باقر مہدی کے ایک اور دوست بھی ہیں قاضی سلیم! وہ

مہاراشٹر اسمبلی اور لوک سبھا کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ باقر انھیں علی گڑھ میں 1945 سے جانتے ہیں۔ وہ اکثر ہمارے گھر بغیر اطلاع ہی کے آتے تھے اور دیر رات میں یا علی الصبح آتے تھے اور دیر تک بیٹھتے تھے۔ باقر کو ان کی شاعری بہت پسند تھی۔ لیکن باقر ان کو نہ صرف شاعر کی حیثیت سے پسند کرتے تھے بلکہ اس لیے بھی پسند کرتے تھے کہ اسمبلی میں کبھی انھوں نے کوئی تقریر کی اور نہ کوئی تقریر سنی۔۔ باقر مہدی کے ایک دوست کئی زبانوں کے ماہر ہیں۔ دنیا جہاں کی سیر کر آئے ہیں۔ ہم لوگ ان کو عالم بے نظیر کے نام سے یاد کرتے ہیں مگر ایک مرتبہ جب میرے شوہر ان کے گھر گئے تو وہاں راجہ مہدی علی خاں کا ایک رقعہ رکھا ہوا تھا جس پر لکھا تھا:

آپ کا نام ظ. انصاری اور مرا نام ظ. پنساری
ایک نقطہ اگر نہ کم ہوتا میں بھی کرتا ادب میں گلکاری

ایک بار باقر نے ظ. انصاری کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ ظ. انصاری صاحب کی کتاب ''غالب شناسی'' کا اجرا تھا اور فراق گورکھپوری اس کی صدارت کر رہے تھے۔ اجرا کی یہ تقریب تین افراد کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھی۔ باقر مہدی قاضی سلیم اور گریش دمانیا۔۔ اس تقریب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلسے میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کا ایک جملہ مجھے اب تک یاد ہے: ''اگر آپ ظ. انصاری کی تعریف میں یہ کہیں کہ دریا بہا دے تو وہ خوش نہیں ہوں گے۔ اگر یہ کہیں کہ تعریف کا قل کھول دیا تو وہ چہک اٹھیں گے۔'' اس تقریب کے بعد باقر مہدی کے تعلقات ظ. انصاری سے تقریباً ختم ہو گئے۔ پھر ایک مدت بعد قاضی سلیم اور باقر مہدی نے کیلے کا ایک پتہ خریدا اور ظ. انصاری صاحب کے گھر لے گئے اور کہا کہ آپ نے ہمارا پتہ کاٹ دیا تھا اب وہ پتہ واپس لائے ہیں قبول کیجیے۔۔۔ یہ کہہ کر دونوں نے یہ پتہ ظ. صاحب کے گھر کے دروازے پر لگا دیا اور اس طرح ناچاقی ختم ہوگئی۔۔

ایک بار میں نے باقر مہدی سے پوچھا کہ آپ کے تمام دوست شہاب ثاقب کی طرح غائب کیوں ہو جاتے ہیں تو انھوں نے خود اپنا ایک شعر پڑھ کر سنایا جو انھوں نے خلیل الرحمن اعظمی سے الگ ہونے کے بعد لکھا تھا:

دوستی ہی تھی، بڑھی اور خشک ہو کر رہ گئی
دل کی دھڑکن سے نظر کا سلسلہ جاتا رہا

□□□


## کلیات محمد قلی قطب شاہ

**مرتبہ: سیدہ جعفر**

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بانی محمد قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا قدر شناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈہ کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

**صفحات: 823، قیمت -/175 روپے**

## کلیات سراج

**مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری**

[illegible]

**دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے**

## کلیات عیش

**مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو**

[illegible]

**پہلا ایڈیشن: صفحات: 556، قیمت: -/80 روپے**

## گلشن بے خار

**مصنف: نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ**

[illegible]

**پہلا ایڈیشن: صفحات: 430، قیمت -/128 روپے**

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

باقر مہدی

# میں اور میرا فن

اپنے بارے میں چند جملے لکھنا بھی دشوار ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو جانتے ہیں کہ زندگی ناقابلِ برداشت "پل صراط" سے گزر رہی ہے اور سب فنکاروں نے اپنی اپنی قیمتیں اپنے اپنے گلے میں "پنہاں طوق" کی صورت لٹکا رکھی ہیں اور جتنا بڑا نام ہے اتنی بڑی قیمت ہے۔ فنکاروں کی خرید و فروخت ہر دور میں ہوتی رہی ہے مگر آج کا دور سب سے سبقت لے جا چکا ہے۔ ایسے ماحول میں ہم متوسط طبقے کے سرکش ادیب اور شاعر فنکار کی کیا باتیں کریں؟ میں نے نوجوانی میں ایک شعر کہا تھا:

ہر شخص کی قیمت ہے بکے جاتے ہیں کتنے
دیکھے سرِ محفل یہ تماشہ کوئی کب تک!

لیکن میں ابھی تک یہ تماشا دیکھ رہا ہوں میرا تیس برس پرانا شعر ہے:

کل بغاوت کا بھی نیلام اٹھا
بوڑھے سرکش کا نشاں ڈوب گیا

پھر جب اتنا گھور اندھیرا ہو تو... تو میں نئے لکھنے والوں سے ملتا ہوں اور فنکاری کی باتیں کرتا ہوں کیونکہ میرے لیے "فرار" یا تسکین کا یہی راستہ بچا ہے۔ ان سے آزاد نظم کی کہانی اور اس کی ناکامی، پھر چند برسوں بعد اس کی مقبولیت کی وجوہ بتاتا ہوں یہی کہ میراجی اور راشد کا آہستہ آہستہ مگر دیرپا اثر ہوا اور شاعری کا سارا لب و لہجہ ہی بدل گیا اور اب "نثری نظموں" کا دور آگیا۔

میرے لیے شاعری، زندگی کی قدم بقدم گردش لیتی برقی رو کا نام ہے۔ میں اسی لیے خود کو ایک "سیاسی شاعر" کہتا ہوں اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ "منظوم اداریے" لکھتا رہتا ہوں۔ اس سے صرف اس قدر مراد ہے کہ شہروں میں جتنی تیز طبقاتی کشمکش نظر آتی ہے اتنی چھوٹے قصبوں میں نہیں اور نئی شاعری اسی "فن سوز" ماحول میں پروان چڑھی ہے اور چڑھے گی۔ آہستہ آہستہ مگر زہر کی طرح اپنا اثر چھوڑتی جا رہی ہے اور نئے لکھنے والے کم از کم اردو میں لکھنا شروع کرتے ہیں تو اضطراری کیفیت سے مجبور ہو کر ہی لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھیں اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ مطالعہ، تجربہ اور جنون کے بغیر شاعری کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ علامت کی تخلیق، استعارے کا استعمال، الفاظ کی دروبست، جذبے کی شدت اور سب سے بڑھ کر ایک لب و لہجہ کی تشکیل مدتوں بعد شاعر سیکھتا ہے اور پھر جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے جذبہ کم، فکر کی ندرت غائب اور زندگی کا بوڑ نہایت خاموشی سے رگ رگ سے ہوتا ہوا شعر اور نظموں میں داخل ہو جاتا ہے۔ کیا سب کا یہی انجام ہے؟ شاید!

میری نسل کے شاعروں کا مسئلہ ترقی پسند ادبی تحریک سے تصادم تھا۔ ان میں کچھ "دقیانوسیت" میں پناہ ڈھونڈ چکے تھے اور "مقبولیت" کی سند کو حاصلِ شاعری سمجھ بیٹھے تھے۔ آج میں اپنے ہم عصروں کا کلام پڑھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان کا شعری سرمایہ کتنا کم ہے اور میرا... تو میرا تو اچھوں اور شاعروں کی فہرست میں نام بھی آنا مشکل ہے اس لیے کہ میں نے "فنکاری" سے زیادہ سرکشی کو مقدم سمجھا تھا۔ اسی لیے میں خود "اپنے ذوقِ کرب آگیں" کا شکار ہو گیا اور اب یہ کہتا ہوں:

مرے دوست دشمن سبھی بک گئے
مرا مول اٹھا آدمی بھیج دے!

میرے تین شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ جنھیں میں نے خود شائع کیا تھا اور اب چوتھا شعری مجموعہ شائع کرنا چاہتا ہوں مجھے کوئی ناشر کیسے ملے گا؟ میں "صاحبِ اقتدار" لوگوں سے مراسم ہی نہیں رکھتا، جتنے بڑے بڑے شہر میں میرے "ناموَر شعرا" سے برائے نام مراسم بھی نہیں ہیں۔ ہاں اردو، مراٹھی، ہندی اور انگریزی کے نوجوان شعرا سے میرے خاصے اچھے مراسم ہیں۔ میں نے اپنے پہلے شعری مجموعہ "شہرِ آرزو" کے بعد ... خاموشی اختیار کی پھر نئے انداز سے شعر کہنے کی کوشش کی۔ میرا دوسرا مجموعہ "کالے کاغذ کی نظمیں" 1967 میں شائع ہوا تھا، اس کے شروع میں ایک نظم دیباچے کے طور پر رکھی تھی۔ اس کی چند سطریں ہیں:

اب میں اپنی نظموں کے صحرا میں
ٹھوکر کھاتا پھرتا ہوں
ایک ایک مصرعے سے یونہی الجھتا رہتا ہوں
ایسا کیوں ہے... ایسا کیوں ہے!
میں نے ان کو بدل بدل کر اور بھی الجھا ڈالا ہے
ان کا نغمہ چیخ بنا اور پھر سناٹے میں کھو سا گیا
کتنے مصرعے کاٹ کے میں نے نئے لکھے لیکن بات نہیں بنتی، یارو!
بات بنے گی کیسے؟
جب ہر پہلو میں ایک نوکیلا کانٹا ہو

مہاراشٹر اسمبلی اور لوک سبھا کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ باقر انھیں علی گڑھ میں 1945 سے جانتے ہیں۔ وہ اکثر ہمارے گھر بغیر اطلاع ہی کے آتے تھے اور دیر رات میں یا علی الصبح آتے تھے اور دیر تک بیٹھتے تھے۔ باقر کو ان کی شاعری بہت پسند تھی۔ لیکن باقر ان کو نہ صرف شاعر کی حیثیت سے پسند کرتے تھے بلکہ اس لیے بھی پسند کرتے تھے کہ اسمبلی میں کبھی انھوں نے کوئی تقریر کی اور نہ کوئی تقریر سنی— باقر مہدی کے ایک دوست کئی زبانوں کے ماہر ہیں۔ دنیا جہاں کی سیر کر آئے ہیں۔ ہم لوگ ان کو عالم بے نظیر کے نام سے یاد کرتے ہیں مگر ایک مرتبہ جب میرے شوہر ان کے گھر گئے تو وہاں راجہ مہدی علی خاں کا ایک رقعہ رکھا ہوا تھا جس پر لکھا تھا:

آپ کا نام ظ. انصاری     اور مرا نام ظ. پنساری
ایک نقطہ اگر نہ کم ہوتا     میں بھی کرتا ادب میں گلکاری

ایک بار باقر نے ظ. انصاری کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ ظ. انصاری صاحب کی کتاب ''غالب شناسی'' کا اجرا تھا اور فراق گورکھپوری اس کی صدارت کر رہے تھے۔ اجرا کی یہ تقریب تین افراد کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھی۔ باقر مہدی قاضی سلیم اور گریش دمانیا— اس تقریب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلسے میں تھلبلی مچ گئی۔ اس کا ایک جملہ مجھے اب تک یاد ہے: ''اگر آپ ظ. انصاری کی تعریف میں یہ کہیں کہ دریا بہا دے تو وہ خوش نہیں ہوں گے۔ اگر یہ کہیں کہ تعریف کا نل کھول دیا تو وہ چہک اٹھیں گے۔'' اس تقریر کے بعد باقر مہدی کے تعلقات ظ. انصاری سے تقریباً ختم ہو گئے۔ پھر ایک مدت بعد قاضی سلیم اور باقر مہدی نے کیلے کا ایک پتہ خریدا اور ظ. انصاری صاحب کے گھر لے گئے اور کہا کہ آپ نے ہمارا پتہ کاٹ دیا تھا اب وہ پتہ واپس لائے ہیں قبول کیجیے— یہ کہہ کر دونوں نے یہ پتہ ظ. صاحب کے گھر کے دروازے پر لگا دیا اور اس طرح ناچاقی ختم ہوگئی—

ایک بار میں نے باقر مہدی سے پوچھا کہ آپ کے تمام دوست شہاب ثاقب کی طرح غائب کیوں ہو جاتے ہیں تو انھوں نے خود اپنا ایک شعر پڑھ کر سنایا جو انھوں نے خلیل الرحمن اعظمی سے الگ ہونے کے بعد لکھا تھا:

دوستی ہی تھی، بڑھی اور خشک ہو کر رہ گئی
دل کی دھڑکن سے نظر کا سلسلہ جاتا رہا

□□□


## کلیات محمد قلی قطب شاہ

**مرتبہ: سیدہ جعفر**

گولکنڈے کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بانی محمد قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا قدر شناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے۔ اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈے کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

**صفحات: 823، قیمت -/175 روپے**

## کلیات سراج

**مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری**

سراج اورنگ آبادی اردو کے پہلے صوفی منش شاعر مانے جاتے ہیں لیکن ان کی شاعری [illegible] بہت خوبصورت [illegible] میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات [illegible] پروفیسر عبدالقادر سروری [illegible] کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں [illegible] مقدمہ بھی ہے جس میں [illegible] شخصیت [illegible] اہم پہلوؤں پر [illegible] گفتگو کی ہے۔

**دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے**

## کلیات عیش

**مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو**

[illegible]

**پہلا ایڈیشن: صفحات: 556، قیمت: -/80 روپے**

## گلشن بے خار

**مصنف: نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ**

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے بزبان فارسی لکھا تھا [illegible] آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہو گیا ہے۔ [illegible] اصل کتاب کے مستند نسخوں کو سامنے رکھ کر سلیس اردو میں منتقل کیا ہے [illegible] مقدمہ لکھا ہے۔

**پہلا ایڈیشن: صفحات: 430، قیمت -/128 روپے**

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

باقر مہدی

# میں اور میرا فن

اپنے بارے میں چند جملے لکھنا بھی دشوار ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو جانتے ہیں کہ زندگی ناقابل برداشت "پل صراط" سے گزر رہی ہے اور سب فنکاروں نے اپنی اپنی قیمتیں اپنے اپنے گلے میں "پنہاں طوق" کی طرح لٹکا رکھی ہیں اور جتنا بڑا نام ہے اتنی بڑی قیمت ہے۔ فنکاروں کی خرید و فروخت ہر دور میں ہوتی رہی ہے مگر آج کا دور سب سے سبقت لے جا چکا ہے۔ ایسے ماحول میں ہم متوسط طبقے کے سرکش ادیب اور شاعر فنکار کی کیا باتیں کریں؟ میں نے نوجوانی میں ایک شعر کہا تھا:

ہر شخص کی قیمت ہے بکے جاتے ہیں کتنے
دیکھے سر محفل یہ تماشا کوئی کب تک!

لیکن میں ابھی تک یہ تماشا دیکھ رہا ہوں میرا تین برس پرانا شعر ہے:

کل بغاوت کا بھی نیلام اٹھا
بوڑھے سرکش کا نشاں ڈوب گیا

پھر جب اتنا گھور اندھیرا ہو تو ... تو میں نئے لکھنے والوں سے ملتا ہوں اور فنکاری کی باتیں کرتا ہوں کیونکہ میرے لیے "فرار" یا تسکین کا یہی راستہ بچا ہے۔ ان سے آزاد نظم کی کہانی اور اس کی ناکامی، پھر چند برسوں بعد اس کی مقبولیت کی وجوہ بتاتا ہوں یعنی کہ میراجی اور راشد کا آہستہ آہستہ مگر دیرپا اثر ہوا اور شاعری کا سارا اسلوب و لہجہ ہی بدل گیا اور اب "نثری نظموں" کا دور آگیا۔

میرے لیے شاعری، زندگی کی قدم بقدم کروٹیں لیتی برقی رو کا نام ہے۔ میں اسی لیے خود کو ایک "سیاسی شاعر" کہتا ہوں اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ "منظوم اداریے" لکھتا رہتا ہوں۔ اس سے صرف اس قدر مراد ہے کہ شہروں میں جتنی تیز طبقاتی کشمکش نظر آتی ہے اتنی چھوٹے قصبوں میں نہیں اور نئی شاعری اسی "فن سوز" ماحول میں پروان چڑھی ہے اور چڑھے گی۔ آہستہ آہستہ مگر زہر کی طرح اپنا اثر چھوڑتی جا رہی ہے اور نئے لکھنے والے کم از کم اردو میں لکھنا شروع کرتے ہیں تو اضطراری کیفیت سے مجبور ہو کر ہی لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھیں اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ مطالعہ، تجربہ اور جنون کے بغیر شاعری کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ علامت کی تخلیق، استعارے کا استعمال، الفاظ کی دروبست، جذبے کی شدت اور سب سے بڑھ کر ایک لب و لہجہ کی تشکیل مدتوں بعد شاعر سیکھتا ہے اور پھر جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے جذبہ کم، فکر کی شدت غائب اور زندگی کا بورڈ نہایت خاموشی سے رگ رگ سے ہوتا ہوا اشعار اور نظموں میں داخل ہو جاتا ہے۔ کیا سب کا یہی انجام ہے؟ شاید!

میری نسل کے شاعروں کا مسئلہ ترقی پسند ادبی نظریے سے تصادم تھا۔ اس لیے وہ "ذاتی نوعیت" میں پناہ ڈھونڈ چکے تھے اور "مقبولیت" کی سند کو حاصل شاعری سمجھ بیٹھے تھے۔ آج میں اپنے ہم عصروں کا کلام پڑھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان کا شعری سرمایہ کتنا کم ہے اور میرا ... تو ادیبوں اور شاعروں کی فہرست میں نام بھی آنا مشکل ہے اس لیے کہ میں نے "فنکاری" سے زیادہ سرکشی کو مقدم سمجھا تھا۔ اسی لیے میں خود "اپنے مذاق کرب آگہی" کا شکار ہو گیا اور اب یہ کہتا ہوں:

مرے دوست دشمن سبھی بک گئے
مرا مول اٹھا آدمی بھیج دے!

میرے تین شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ جنھیں میں نے خود شائع کیا تھا اور اب چوتھا شعری مجموعہ شائع کرنا چاہتا ہوں مجھے کوئی ناشر نہیں ملتا کیونکہ میں "صاحب اقتدار" لوگوں سے مراسم ہی نہیں رکھتا، اتنے بڑے ملکی شہرت کے میرے "نامور شعرا" سے برائے نام مراسم بھی نہیں ہیں۔ ہاں اردو، مراٹھی، ہندی اور انگریزی کے نوجوان شعرا سے میرے خاصے اچھے مراسم ہیں۔ میں نے اپنے پہلے شعری مجموعہ "شہر آرزو" کے بعد دس سال خاموشی اختیار کی پھر نئے انداز سے شعر کہنے کی کوشش کی۔ میرا دوسرا مجموعہ "کالے کاغذ کی نظمیں" 1967 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے شروع میں ایک نظم دیباچے کے طور پر رکھی تھی۔ اس کی چند سطریں ہیں:

اب میں اپنی نظموں کے صحرا میں
ٹھوکر کھاتا پھرتا ہوں
ایک ایک مصرعے سے یونہی الجھتا رہتا ہوں
ایسا کیوں ہے ... ایسا کیوں ہے!
میں نے ان کو بدل بدل کر اور بھی الجھا ڈالا ہے
ان کا نغمہ چیخ بنا اور پھر سناٹے میں کھو سا گیا
کتنے مصرعے کاٹ کے میں نے نئے لکھے لیکن بات نہیں بنتی، یارو!
بات بنے گی کیسے؟
جب ہر پہلو میں ایک نوکیلا کانٹا ہو

ہر کانٹے میں پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو ہو
ہر خوشبو میں زہر چھپا ہو ۔ !
میں نے خود سے پوچھا ہے
کیوں لکھتا ہوں کیوں ۔ ۔ ؟
یہ اظہار کی پیہم خواہش
جینے کی بے معنی ہوس
کب تک میرے ساتھ رہے گی
میرے پاس سوالوں کے تیز نوکیلے نشتر ہیں
اور بھلا کیا ہے؟
ہر لحہ، یہ..... ڈیلما مجھ میں چھپ کر
میرے ساتھ رہا کرتا ہے
میری نظمیں عکس ہیں اس کا
لرزاں لرزاں، دھندلا دھندلا
شاید کچھ کچھ بے معنی سا!"

یہ نظم آج سے 14 برس پہلے لکھی تھی اور آج جب کہ میں "بیماریوں کے بھنور" میں گھر گیا ہوں کہ تیز زندگی گزارنے کا یہی انجام ہوتا ہے تو اپنی زندگی کے سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں:

میری نظمیں خود فریبی سے آگے نکلتی نہیں۔
اور میں ۔ ایک کرم کتابی
تیز آندھی ٹوٹی تمنا لیے
اپنی کمزور نظموں کی شاخوں سے لپٹا ہوا
زرد پتوں کو اڑتا ہوا دیکھتا हوں!

□□□


कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

**National Council for Promotion of Urdu Language**

Ministry of HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India
West Block-8, R.K. Puram, New Delhi-110 066.
Ph.: 26109746, 26169416 Fax:26108159, E-mail: urducouncil@rediffmail.com

# پٹنہ کتاب میلہ

**تاریخ : یکم دسمبر تا 12 دسمبر 2006**
**وقت : 11 بجے دن سے شام 8 بجے تک**
**مقام : گاندھی میدان، پٹنہ**

**قومی اردو کونسل کے اسٹال پر آپ کا خیر مقدم ہے،**
**جہاں ہر موضوع پر کتابیں دستیاب ہیں**

مثلاً ادبیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، ثقافت، لسانیات، لغات، قواعد اور علم کتب خانہ، فلسفہ، تعلیم، نفسیات، مذہب، سماجیات، معاشیات، تجارت، سائنس اور ٹیکنالوجی، بچوں کا ادب، (CBT in Urdu) طب و معالجات

نوٹ: شناختی کارڈ دکھانے پر اساتذہ اور طلبہ کے لیے خصوصی رعایت۔ کچھ اہم کتابوں پر 75 فیصد تک رعایت

باقر مہدی

# چند نظمیں اور غزلیں

## ایک کافی نظم

(غیر مطبوعہ)

میں کافکا کا جھینگر بن نہ سکا
بھنورا بن کر — پھول پھول پر ناچ رہا ہوں
مالی مجھ کو دیکھ کے کتنا خوش ہے
ننھی سی اک لڑکی مجھ سے ڈرتی ہے
کِل کِل مسکاتی ہے
اور ہوا کے جھونکے آ کر
مجھے اُڑا لے جاتے ہیں
ادھر ادھر — روش روش چکر کھا کر آتا ہوں
پھول پھول پہ ناچ رہا ہوں
باغ میں اب تو کوئی نہیں ہے
شاید پت جھڑ کا موسم آ پہنچا ہے
گرم ہوا چلنے والی ہے
میں بھی پل دو پل جی کر
مر جاؤں گا

(28 مارچ 2003)

○

## ایک کافی غزل

(غیر مطبوعہ)

لفظ سے لفظ ہے بیزار خدا خیر کرے
شعر کہنا ہوا دشوار خدا خیر کرے
اک قلم ہاتھ میں آ کر بھی رہا خوابیدہ
سادہ کاغذ ہی ہے بیدار خدا خیر کرے
عمر کے ساتھ مرے پاؤں میں طاقت نہ رہی
لڑکھڑاتا ہے گنہگار خدا خیر کرے
خواب پلکوں سے نکل آتے ہیں آنسو بن کے
ذہن بھی ہو گیا بیمار خدا خیر کرے
کوئی بیگانہ ہے یارو نہ یگانہ باقر
وہم میں سب ہیں گرفتار خدا خیر کرے

(23 ستمبر 2003)

○

## غزل

(غیر مطبوعہ)

ہیں گل مہر کے پیڑ بھی دریا بھی دھوپ بھی
خاموش دیکھتا ہے ہر اک شے کو بے نوا
بوڑھا سا ایک شخص کہاں سے یہ آ گیا
مجھ ناتواں کو خضر کی دیتا رہا دعا
تنہا کہاں ہوں گو کہ یہاں بھی کوئی نہیں
مجھ سے لپٹ کے سوتا ہے سایا خفا خفا
نغمہ بنا کے مجھ کو فضا میں اڑا دیا
اب میں کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں تری صدا؟
راتوں کو جاگ جاگ کے اٹھتا ہوں بار بار
کافی کو پی کے ذہن کو دیتا رہا سزا
نغمے، دو، نے کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا
یہ کیسے مل گئے، رہے کل تک جدا جدا
جینے کی راہ چھوڑ کے آگے نکل گیا
منزل پکارتی رہی جاتا ہے سرپھرا

(7 ستمبر 2003)

○

## ریت اور درد

مدتیں گزریں مرے دل کو ہوئے ویرانہ
آندھیاں بھی نہیں آتیں
کہ اڑے ریت، مٹے نقشِ سراب
اور اک درد کا چشمہ
مندمل زخموں سے پھوٹے نئی خنکی لے کر

پیاس جاگ اٹھے، سکوتِ دلِ مضطر ٹوٹے
تاکہ میں دیکھ سکوں!
اپنی بے خواب سی آنکھوں سے وہ منظر اک دن
ریت کے تودے فضاؤں میں اڑے جاتے ہیں
اور خوش ہو کے کہوں!
''زندگی ریت سہی، درد کا چشمہ بھی تو ہے''

شعری انتخاب ''سیاہ سیاہ'' (بمبئی، 1961)

○

## لمحوں کے قیدی

ہال میں نیلی سی کم کم روشنی
چھت سے لٹکی کاغذی بیلیں
فضا میں جھومتے رنگیں غبارے
اور دیواروں سے سرگوشی کا شور الاماں!
فرش پر قدموں کی آہٹ دل کی دھڑکن سے سوا
تیز رقص — جیسے،
کتنے سائے ایک جسم آہنی میں قید ہوں
سوچتے — کاش!
آج ارمانوں کے جل بجھنے سے پہلے
اپنے ہر اک خون کے قطرے کا لے سکتے حساب
وحشیانہ لے میں بجتے ایک کونے میں رباب
ایک خوشبو کا تعفن ہر طرف پھیلا ہوا —!
نظریں دہراتی حریصانہ اشارے
لب تبسم کی ہوس میں کچھ سکڑتے، پھیلتے
انگلیوں کے لمس سے بڑھتی حرارت جذبۂ بے تاب کی
ایسا جذبہ جس کو ٹھنڈی آگ نے روشن کیا!

ایلیٹ کے کھوکھلے انسان رقصاں ہیں ابھی
انقلابی، مسخرے، مشہور اور گم نام سب،
اپنی روحوں کے یہ سوداگر
ڈھونڈنے نکلے ہیں
اپنے حصے کی مسرت جس کا ملنا ہے محال
یہ خوشی کی جستجو ہے یا فرار —؟

سالِ نو کی منتظر!
اک گھڑی لمحوں کی قیدی
جانے کیسے گر پڑی دیوار سے،
سب ڈرے اچھا نہیں ہے یہ شگون.
میں نے ہنس کر اک حسینہ سے کہا
''وقت کو گھڑیوں میں کب تک بند رکھے گا کوئی!''

شعری انتخاب ''سیاہ سیاہ'' (بمبئی، یکم جنوری 1964)

○

## گودو

### (سیموئیل بیکٹ کا مشہور علامتی کردار — گودو کا انتظار)

ہوائیں چلتی ہیں، تھمتی ہیں بجنے لگتی ہیں
نئے لباس، نئے رنگ روپ، سج دھج سے
پرانے زخم نئے دن کو یاد کرتے ہیں
وہ دن جو آکے نقابیں اتار ڈالے گا
نظر کو دل سے ملائے گا، دل کو باتوں سے
ہر ایک لفظ میں معنی کی روشنی ہوگی!

مگر یہ خواب کی باتیں، سراب کی یادیں
ہر ایک بار پشیمان، دل گرفتہ ہیں
صبح کے سارے ہی اخبار وحشت افزا ہیں
ہر ایک رہزن و رہبر کی آج بن آئی
کہ اب ہر ایک جیالا ہے سورما سب ہیں!

بتاؤں کس سے کہ میں منتظر ہوں جس دن کا
وہ شاید اب نہ کبھی آئے گا زمانے میں
کہاں پہ ہے ''مرا گودو'' مجھے خبر ہی نہیں
اسے میں ڈھونڈ چکا روم اور لندن میں
نہ ماسکو میں ملا اور نہ چین و پیرس میں
بھلا ملے گا کہاں بمبئی کی گلیوں میں!

یہ انتظار مسلسل، یہ جاں کنی، یہ عذاب!
ہر ایک لمحہ جہنم — ہر ایک خواب سراب!!

شعری انتخاب ''سیاہ سیاہ'' (بمبئی 16 ستمبر 1965)

○

## غزل

آئینہ توڑ کے چہرا دیکھوں!
عکس کمرے میں تڑپتا دیکھوں!

پھول کو ریت میں کھلتا دیکھوں!
کانٹے کانٹے پہ مچلتا دیکھوں!

آسمانوں سے پرے جاکر میں
اے خدا! تجھ کو بھی تنہا دیکھوں!

میں جو بولوں تو ہر اک شخص خفا
اور خاموشی کو رُسوا دیکھوں!

کالے کاغذ کی نئی نظموں میں
لال شعلہ سا بھڑکتا دیکھوں!

شعری انتخاب "سیاہ سیاہ" (1968)

○

## غزل

کہتے ہیں زندگی کی ضیا لے گئی ہوا
اور جاتے جاتے کالی گھٹا لے گئی ہوا

اک شور بے نوا مری آنکھوں میں رہ گیا
بے کس کے قہقہوں کا مزا لے گئی ہوا

معنی کی جستجو مجھے رنگوں میں لے گئی
لفظوں کے ٹوٹنے کی ادا لے گئی ہوا

سادے ورق کتاب میں جلتے ہی رہ گئے
خوابوں کا ایک باب لکھا لے گئی ہوا

دھڑکن بنا کے تم کو لہو میں چھپا لیا
خوشبو بنا کے کیسے چرا لے گئی ہوا؟

شعری انتخاب "سیاہ سیاہ" (1969)

○

## سیلف پورٹریٹ

اپنا چہرہ
اپنی داڑھی
— نیم گنجا سر
موٹے چشمے میں چھپی
انسومنیا کی آنچ میں جلتی ہوئی
آنکھیں
کیسے رنگوں، دائروں، ٹیڑھی لکیروں
اور لفظوں سے ابھاروں؟
راکھ کل کی
آج کے ہنگامے
آنے والی بھوری شامیں
کیسے اِن سب کو ملاؤں —؟
کس طرح اپنی بغاوت، — قہقہے
جینے کی لگن، — قید،
درد — غصے کو
لفظوں، رنگوں اور لکیروں میں بدل دوں؟
آئینہ تو بارہا دیکھا مگر
آئینے میں عکس بے رنگ ہے!

شعری انتخاب "سیاہ سیاہ" (1969)

○

## اک طویل بوسے میں!

اک طویل بوسے میں
کیسی پیاس پنہاں ہے؟
تشنگی کی ساری ریت
اُنگلیوں سے گرتی ہے!
میرے تیرے پیروں کے
ایک لمس سے
کیسے — اک ندی سی
بہتی ہے!
کیوں امید کی کشتی
میری — تیری آنکھوں سے
ڈوب کر ابھرتی ہے؟

روز اپنے ساحل سے
اک نئے سمندر تک
جا کے لوٹ آتی ہے!
میرے تیرے ہاتھوں کی
آگ سے جل اٹھے ہیں
قمقمے سے کمرے میں!
اس نئی دوالی کی
آرتی اتاریں گے!
آنے والی راتوں کے
پھول، قہقہے، آنسو —!

"سیاہ سیاہ" (بمبئی، 1971)

سید محمد عمیر

# طلبہ کے لیے عملی زندگی میں رہنمائی

قومی ترقی افراد پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ افراد مسائل کا ادراک کر کے ان کے حل اور مقصد تک پہنچنے کے عمل کا تعین کرتے ہیں۔ ان افراد کے مختلف تجربات اور معلومات کے نچوڑ کو کام میں لاتے ہوئے افراد سازی کا کام کیا جاتا ہے۔ سماج کی مختلف ضروریات اور طلبہ کے رجحان، پسند، ناپسند کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان کے پاس موجود وسائل کو بروئے کار لا کر منزل تلاش کرنا کاؤنسلنگ اور گائڈنس کا عمل ہے۔

کاؤنسلنگ اور گائڈنس اپنے طبعی معنی کے اعتبار سے زندگی کے ہر میدان میں دخیل ہے لیکن عموماً اور محاورہ میں اس کا استعمال تعلیم و تربیت کے لیے خاص ہے۔

تعلیمی ترقی یا بہتر مستقبل کی تلاش کے لیے طلبہ، اساتذہ اور ماہرین کے درمیان یہ کارروائی انجام پاتی ہے۔ کاؤنسلنگ اور گائڈنس کی ضرورت عموماً جن شعبوں میں ہوتی ہے وہ درج ذیل چھ میدان ہیں۔

1. تعلیمی رہنمائی (Educational Guidance)
2. ہنر یا پیشہ کی رہنمائی (Vocational Guidance)
3. پرسنل یا ذاتی رہنمائی (Personal Guidance)
4. صحت کی رہنمائی (Health Guidance)
5. سماجی مسائل کی رہنمائی (Social Guidance)
6. خالی اوقات کے بہتر استعمال یا شوقیہ کاموں کی رہنمائی (Vocational Guidance)

1. تعلیمی رہنمائی کی ضرورت طالب علم کو اس وقت ہوتی ہے جب وہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کر رہا ہوتا ہے اس وقت طالب علم کے ذہن میں اپنے کو مختلف انداز مثلاً استاد، ڈاکٹر، انجینئر یا تاجر بن کر سماج کے سامنے آنے اور اپنی شخصیت کی تعمیر کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت کرنے کا جذبہ ہوتا ہے، اس کے لیے اسے گائڈنس کی ضرورت ہوتی ہے کہ کس طرح وہ ایک ماہر اور کامیاب انسان بن سکے۔ اسے کن کتابوں، کن موضوعات کے ساتھ کتنی تربیت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ اپنے اس خواب کو پورا کرنے کے لیے ماہرین سے مشورہ کرتا ہے اور ان کی رہنمائی میں اپنی تعلیم کو آگے بڑھاتا ہے۔

2. اسی طرح ایک شخص یا طالب علم جو کہ تعلیمی سلسلے کو آگے نہیں بڑھا سکتا ہے تو وہ کوئی ہنر سیکھنا چاہتا ہے تاکہ اس فن میں وہ مہارت حاصل کر کے ترقی کی منزلیں طے کرے۔ لہٰذا اس کے سامنے اپنے حالات کے پیش نظر جو مشکلات یا رکاوٹیں ہوتی ہیں یا وہ خود فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے یا کسی میدان میں کیا مواقع اس کے لیے ہو سکتے ہیں وہ متعلقہ شعبے کے لوگوں سے مل کر اپنے پروگرام کے متعلق خاکہ اور پلان تیار کرتا ہے۔

3. رہنمائی کا تیسرا میدان ذاتی معاملات کی رہنمائی ہے۔ ایک شخص اپنے ذاتی معاملات میں الجھنوں کا شکار ہوتا ہے، بچوں کے مستقبل، تعلیم، خاندانی حیثیت یا ایسے معاملات جن کی وجہ سے خود کو ذاتی طور پر یا اپنے دوستوں کے ساتھ، گھر والوں کے ساتھ، کاروباری زندگی میں ایڈجسٹ نہیں کر پا رہا ہے تو وہ کسی غمخوار اور ہمدرد کے پاس جا کر اپنے حالات پیش کرتا ہے اور اس الجھن سے نکلنے کے لیے مشورہ اور رہنمائی چاہتا ہے۔ یہ رہنمائی کا بہت اہم شعبہ ہے اور اس کے بھی بہت سے شعبے ہیں۔

4. چوتھا شعبہ جس میں انسان کو رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے وہ صحت ہے یعنی آدمی کی بیماری، جسمانی تکلیفیں وغیرہ۔ اس کے لیے انسان ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے۔ ڈاکٹر اس کے احوال اور بیماری کی تفصیلات جان کر دوا تجویز کرتا ہے۔ یہ عمل بھی کاؤنسلنگ اور گائڈنس کے ضمن میں آتا ہے۔

5. رہنمائی کی پانچویں قسم سماجی مسائل ہے یعنی اس اہم شعبے میں انسان کو بار بار مشورے اور رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان اپنی ذاتی زندگی کے پہلو بہ پہلو سماجی زندگی سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ سماج میں رہ کر سماج کے ساتھ اس کے کردار کا تعارف سامنے آئے۔ سماجی مسائل، اپنے ہمسایوں، رشتہ داروں اور اپنے گاؤں، شہر، قصبہ کے لوگوں کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ سماج میں اس کا تعمیری کردار ہو اور سماج میں اس کی عزت ہو اور سماج کے لوگ اس کو اپنا ہمدرد، غم خوار اور خیر خواہ سمجھیں۔ اس کے لیے انسان از خود بھی فکر کرتا ہے ساتھ ہی کسی اہم مسئلے پر اسے

بڑوں، تجربہ کاروں اور عقلمند لوگوں کے مشورے کی ضرورت ہوتی ہے جو سماجی رہنمائی کہلاتی ہے۔

6. رہنمائی کا اہم شعبہ خالی اوقات کے ایسے استعمال کی رہنمائی ہے کہ جو غیر تجارتی یا نیم پیشہ ورانہ ہو۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف تو طالب علم کے شوق اور رجحان کے مطابق اس کے استعمال کی رہنمائی کی جائے تاکہ اس کا شوق پروان چڑھے اور اس میں ترقی ہو، اسی کے ساتھ طالب علم چاہے تو اس کے ذریعہ مالی منفعت بھی حاصل کر سکے۔ مثلاً خالی اوقات میں فوٹو گرافی کرنا، آرٹ بنانا، لکھنا یا وقتی تجارت کر لینا وغیرہ۔ لڑکیوں کے لیے سلائی کڑھائی، بیوٹی پارلر وغیرہ جیسے کام ہو سکتے ہیں۔ کمپیوٹر ڈیزائننگ اور اس جیسے دیگر کام بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔

رہنمائی کی تمام اقسام کی اگر مشترکہ طور پر قدر پیمائی کی جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ اس کے مندرجۂ ذیل مقاصد ہو سکتے ہیں۔

1. انسان کی صحیح رہنمائی تاکہ وہ ادھر ادھر نہ بھٹکے۔
2. وقت اور اس کا بہتر استعمال۔
3. آدمی کو اس کی پسند اور منشا کے مطابق اس کی ترقی میں معاونت۔
4. انسان کی الجھنوں کو دور کرنا، جن سے نکلنے کے لیے وہ خود کچھ نہیں کر سکتا ہے۔
5. انسان کی زندگی کو ذات، سماج، کاروبار، تعلیم اور مختلف معاملات کے تئیں پہلو دار بنانا تاکہ ایک ہی شخص مختلف جگہوں پر اپنی نمائندگی اور حاضری کو غیر ضروری نہ سمجھے۔
6. صحت کے تئیں انسان کو باخبر اور فکر مند رکھنا۔

□□□

رابطہ:
"Thikana"
504/55 Nadwa Road
Lucknow-226020 (U.P.)

## حالی

### مصنف: صالحہ عابد حسین

ایک شاعر، ادیب، نقاد، سوانح نگار کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالی ایک سماجی مصلح بھی تھے۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اصلاح کے لیے شاعری کا سہارا لیا بلکہ شعر و ادب کی کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی اور اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق کی ترغیب دی۔ صالحہ عابد حسین نے حالی کی شخصیت اور زندگی کے تمام گوشے اس کتاب میں اجاگر کیے ہیں۔

صفحات: 68، قیمت -/15 روپے

## محمد حسین آزاد

### مصنف: نند کشور وکرم

محمد حسین آزاد ہمارے ان اکابرین میں سے ہیں جنھوں نے اردو کی ادبی تاریخ کا رخ موڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ انجمن پنجاب کے ذریعے انھوں نے جدید نظم کو فروغ دینے کے ساتھ آبِ حیات، دربارِ اکبری، نیرنگِ خیال اور سخندانِ فارس جیسی اہم کتابیں بھی لکھیں۔ نند کشور وکرم نے اس کتاب میں آزاد کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 79، قیمت: -/18 روپے

## اقبال کی کہانی

### مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال وہ عظیم شاعر اور فلسفی ہے جسے عالمی ادب کے منظر نامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شگفتہ مزاج انسان بھی تھے۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں سے بڑے باریک نکتے، اسرار اور لطیفوں کے چمن زار کھلتے تھے۔ اقبال کو اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے مضامین لکھے اور خوب صورت نظمیں کہیں جنھیں پڑھ کر بچے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ ماہرِ اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اس کتاب میں اقبال کا جامع تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/11 روپے

## جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن

### مصنف: ظفر محمود

جوش ملیح آبادی اردو شعر و ادب کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے نہ صرف شاعری کو خوب صورت زبان عطا کی بلکہ نثر میں بھی گل کاری کی ہے۔ ان کے شعر و ادب کے مطالعے سے خود اعتمادی، جوش اور اپنے ملک و تہذیب کی بقا کے لیے سینہ سپر ہونے کا پیغام ملتا ہے۔ نہ صرف ان کا فن بلکہ خود شاعر کی زندگی کے حالات اس پیغام کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ ظفر محمود نے "جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن" میں شاعر کی زندگی اور فن کے انھی گوشوں کو اجاگر کیا ہے جن سے نئی نسل کی ذہنی و علمی تربیت ہوتی ہے۔

صفحات: 105، قیمت -/38 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

مولف: محمد انصار اللہ

# جامع التذکرہ سے اقتباس

انجام:

نواب امیر خاں عمدۃ الملک، انجام۔ فارسی میں میرزا بیدل کے شاگرد۔ ریختہ گوئی و ہندی، علم موسیقی ولطیفہ گوئی، بدیہہ سرائی اور حاضر جوابی اور تمام کمالوں میں بے بدل تھے۔ اب سے چھ برس پہلے رحلت کی۔ (گردیزی)

شاہ نعمت اللہ ولی کے پوتوں میں ہے۔ ہندوستان میں ان کے آبا امارت اور وزارت سے مشرف تھے۔ محمد شاہ کے عہد میں یہ ہفت ہزاری منصب اور متعدد خدمات سے سرفراز رہے۔ معاصروں کو اس سے حسد تھا نادر گردی کے بعد آصف جاہ سے رنجش کے سبب الہٰ آباد کی صوبیداری پر چلا گیا۔ پھر ظل سبحانی کی طلب پر یہ مطلع عرض کیا:

اب یہی احسان ہے تیرا جو نہ ہوں آزاد ہم
پھر چمن میں جائیں کیا منہ لے کے اے صیاد ہم

اعتمادالدولہ وزیر کے لکھنے سے حضور میں آیا۔ تین سال نہ گزرے تھے کہ غلام نمک حرام کے ہاتھوں فولاد کے جمدھر سے قلعہ بادشاہی کے دروازے کی جالی کے ٹھیک قریب شہید ہوا (قایم) میر میراں امیر خاں یزدی ناظم کابل کے بیٹے ہیں۔ شفیق نے ایک کے تخرجہ سے تاریخ کہی۔

جان دادا میر خاں انجام۔ 1060 (شفیق)

کسی نمک حرام نے دشمنوں کے اشارے سے شہید کیا (حسن) ذکاوت، ذہانت اور لطیفہ میں بے مثل تھا۔ (مبتلا) ارسطوئے زمانہ ہے (شورش) ان کے والد میر میراں امیر خاں یزدی اورنگ زیب کے عہد میں بائیس سال تک کابل کے ناظم رہے۔ 1090 میں وفات پائی۔ پالکی پر سوار دربار شاہی میں جا رہے تھے کسی نے عین سواری پر حملہ کیا۔ یہ واقعہ شاہجہاں آباد میں 1190 ھ میں پیش آیا (افتخار) علم موسیقی میں وہ مہارت کہ اس فن کے استاد زانوئے شاگردی تہہ کرتے ہیں۔ اشعار فارسی وریختہ کے علاوہ کبت ودوہرہ بہت خوب کہتے تھے۔ ان کے چٹکلے لطیفے زبان زد ہیں۔ لطیفہ:

ایک روز بادشاہ نے فرمایا کوئی حسین لڑکا بلایا جائے تاکہ رویت ہلال کے وقت اس کی صورت دیکھی جائے۔ علی وردی خاں نے از روئے مزاح کہا، امیر خاں کو حکم ہو کہ اپنے صاحبزادے کو بلائیں۔ امیر خاں نے سر تسلیم خم کر کے کہا، بندہ حاضر ہے، بلاتا ہے لیکن آئندہ مہینہ کے لیے علی وردی خاں کو حکم ہو کہ وہ اپنی صاحبزادی کو تیار رکھیں۔ بادشاہ اور جملہ حاضرین خوب ہنسے۔

لطیفہ: خاندوراں نے امیر خاں سے کہا کہ ہر فرقہ جس کے آخر میں لفظ 'بان' ہوتا ہے، بڑا حرامزادہ اور بدمعاش ہوتا ہے مثلاً فیلبان، شتربان اور بہلبان۔ امیر خاں نے جواب میں کہا کہ 'ٹھیک کہتے ہیں مہربان'۔

لطیفہ: ایک دفعہ لڑکپن کے زمانہ میں امیر خاں سے ان کے والد نے کہا کہ جاؤ اپنی والدہ سے کہو کہ اچھا لباس پہن کر اور خود کو آراستہ کر کے میرے آنے کی منتظر رہیں۔ خان مذکورہ فطرتاً ظریف تھے۔ ہاتھ باندھ کر بولے کہ اگر والدہ صاحبہ کسی کام میں مصروف ہوں تو دادی صاحبہ سے کہہ دوں۔

کٹار سے زخمی کر کے شہید کر دیا۔ کسی نے شہادت کی تاریخ 'ظلم عمدہ' سے نکالی۔ چونکہ مرحوم عورتوں کی وضع پر رہنے کے لیے مشہور تھے، کسی ظریف نے انھی کی طرز پر یہ تاریخ کہی: اوہ لوگو امیر خان موا۔

بعض لوگ اس کو نور بائی طوائف سے منسوب کرتے ہیں جو بڑی حاضر جواب اور سخنوری کے شیوہ میں اپنے زمانے میں بے نظیر تھی (امر اللہ) والہ داغستانی نے لکھا ہے کہ میں نے اکثر دقائق سخن انجام کی صحبت میں سیکھے ہیں (مصحفی)

سلسلۂ نسب میر میراں نعت الٰہی سے ملتا ہے جو سلاطین صفویہ سے رشتہ رکھتے تھے۔ 1149 ھ میں ایک نمک حرام نے کٹاری سے شہید کر دیا۔ اکثر کو گمان تھا کہ یہ بادشاہ کا اشارہ ہے۔ پہیلی اور مکرنی کہنے کی مشق حد سے زیادہ تھی (لطف) ریختہ کے مقابل جو مذکر ہے اس نے ریختی تصنیف کی۔ لطیفہ گوئی اور پہیلی میں یکتائے وقت تھا۔ ایک دن کم خواب کا پاجامہ پہنا۔ نور بائی

---

شعرائے اردو کے تذکرے نہ صرف شعرا کے احوال و کوائف سے متعارف کراتے ہیں بلکہ ان میں شامل انتخاب کلام سے ان شعرا کی درجہ بندی اور ان کی ادبی قدروقیمت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے اردو تنقید کا اولیں نقش بھی ہیں۔ پروفیسر محمد انصار اللہ نے اس کتاب میں بڑی محنت سے اردو اور فارسی تذکروں میں شامل مختلف شعرا سے متعلق مواد کو حروف تہجی کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔ 384 صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/140 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45 فیصد اور اساتذہ کو 40 فیصد کی رعایت دیتی ہے۔

ڈومنی نے کہا نواب صاحب آج کیا کا فرازار پہنا ہے۔ جواب دیا کہ اس کے اندر مسلمانی بھی ہے (قدرت) موسیقی اور قیافہ شناسی میں نہایت ماہر (خلیل)۔ تاریخ وفات:

مسکنِ آلِ نبی خلدِ بریں= 1159ھ (بیدار)

انجام دہلوی، عمدۃ الملک امیر خاں، بیچ بیلی و مکرنی، فارسی و ریختہ کے ثانی اپنا نہ رکھتے تھے۔ فردوس آرامگاہ کے وقت میں کناری لگی اور توتی روح پرواز کرگئی۔ (حیدری) امیر خاں انجام، امیر خاں عالم گیری کا بیٹا ہے (بے خبر) امیر خاں انجام بن نواب امیر خاں، سلسلۂ نسب حضرت ختمی پناہ تک پہنچتا ہے (اخلاص) انجام، عمدۃ الملک امیر خاں خلف امیر خاں یزدی ناظمِ کابل، جو قریب بائیس برس عالمگیر بادشاہ کے عہد میں صوبۂ کابل کی نظامت کر کے گیارہ سو نو ہجری میں فوت ہوئے اور جن کا نسب میر میراں نعمت اللّٰہی تک جو سلاطین صفویہ کے رشتہ دار تھے پہنچتا ہے۔ ان کے بزرگ ایران اور ہندوستان میں نہایت صاحب اعتبار تھے۔ عمدۃ الملک فردوس آرامگاہ محمد شاہ کے دربار میں تقرب کی زیادتی سے محسودِ اقران تھے چنانچہ نواب آصف جاہ خدیوِ دکن جو اس زمانے میں دارالخلافہ جہاں آباد گئے تھے اور اعتماد الدولہ قمرالدین خاں وزیر اعظم نے بادشاہ سے عرض کیا کہ اگر حضور میں عمدۃ الملک ہیں تو ہم نہیں رہیں گے اور دونوں امیر کبیر شاہجہاں آباد سے نکل کر میدانِ تلپٹ میں مقیم ہوئے اس لیے بادشاہ نے سنہ گیارہ سو باون میں عمدۃ الملک کو صوبہ داری الٰہ آباد پر مامور کیا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد نواب آصف جاہ از وزیر الممالک تلپٹ سے پایۂ تخت میں آئے۔ اتفاق سے کسی ضرورت سے آصف جاہ گیارہ سو ترپن میں بادشاہ سے رخصت ہو کر دکن کے لیے روانہ ہوئے تو بادشاہ نے گیارہ سو چھپن میں عمدۃ الملک کو الٰہ آباد سے بلا کر پہلے کی طرح موردِ عنایت کیا۔ سنہ گیارہ سو انسٹھ میں کسی نے بادشاہی دیوانِ عام کے صحن میں جمدھر کی چوٹ سے ان کو شہید کر دیا۔ لوگوں نے وہیں قاتل کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا میں نے تاریخ کہی:

رفت آں یکتا و گشت تاریخ
جاں داد امیر خاں انجام

عمدۃ الملک خوش فکر تھے۔ بذلہ سنجی، حاضر جوابی، ادا فہمی میں نظیر نہیں رکھتے تھے اور ہندوستانی موسیقی میں استادی کا درجہ رکھتے تھے (یکی)

بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی، حاضر جوابی اور موسیقی دانی میں عدیم المثال تھا۔ نقل ہے کہ جب نادر شاہ نے تسلط پالیا، ایک دن دونوں بادشاہ دیوان خاص میں تھے۔ قہوہ آیا۔ فردوس آرامگاہ نے نواب امیر خاں کو ساقی گری کا حکم دیا۔ اس نے دل میں خیال کیا کہ اگر پہلا جام نادر شاہ کو دوں تو یہ اپنے بادشاہ کی تحقیر ہے اور اگر اپنے بادشاہ کو دوں تو وہ سفاک بادشاہ قتل کرا دے گا۔ اس نے تامل کے بعد پیالہ محمد شاہ کو دیا اور کہا کہ بادشاہ مہمان ہیں، حضرت اپنے ہاتھ سے تواضع فرمائیں۔ اس کی یہ بات دونوں بادشاہوں نے پسند کی (حیرت)

**بیدل:**

مرزا عبدالقادر بیدل، فارسی کا پرزور شاعر، صاحب دیوان، جس میں پچاس ہزار شعر اور مثنویاں ہیں۔ شروع جوانی میں شاہزادہ محمد اعظم شاہ کا نوکر ہوا، پھر نوکری چھوڑ دی۔ ریختہ کے دو شعر ان کے نام سے سنے (میر) بیدل نے بھی اس زبان میں ایک غزل کہی (قائم) فارسی کا صاحب طرز، زبردست شاعر، دو شعر ہندی بھی سنے گئے (حسن) استادفن، دارالخلافت میں داد سخنوری دیتا تھا، متعدد مثنویاں اور دواوین اور رنگین نثر رکھتا ہے۔ پہاڑ کی تعریف میں اچھا شعر کہا تھا (تمنا) عظیم آبادی، قوم ارلاس، ابتدا میں محمد اعظم شاہ کا نوکر۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ شاعر ہیں تو اپنی مدح میں قصیدہ کی فرمائش کی۔ مرزا کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ بے نیازی سے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ شاہجہاں آباد میں گوشہ نشین ہوگئے۔ خداوندِ حقیقی سے درویشی کا منصب پایا۔ نواب شکر اللہ خاں اور شاکر خاں دل سے معتقد تھے۔ آصف جاہ خود کو ان کا شاگرد بتاتے تھے، اپنی مسند پر جگہ دیتے۔ یہ نظم اور نثر دونوں میں بے نظیر تھے۔ ان کو پہلوانِ سخن کہنا بجا ہے۔ زیادہ تر بحرِ کامل میں شاعری کرتے ہیں۔ شاہجہاں آباد میں (دسمبر 1760) 3۔صفر 1133ھ کو رحلت کی (افتخار) اصل وطن کرولاس، ولادت عظیم آباد، نشو ونما ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہوئی، زیادہ تر بنگالہ میں رہے۔ آصف جاہ جب (20-1719) 1132ھ میں ملک دکن پر مسلط ہوئے تو انھیں دعوت دی۔ انھوں نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا:

دنیا اگر دہند نہ خیزم زجائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

3۔صفر 1133ھ کو وفات پائی، شاہجہاں آباد میں اپنے صحن خانہ میں دفن ہوئے (امراللہ) نثر نویسی میں یکتا ہے۔ نکاتِ بیدل مشہور ہے (شورش) رقعات کی انشادلوں میں گھر کرتی ہے۔ غلام علی آزاد نے تاریخ کہی: میرزا بیدل از عالم رفت = 1133ھ (شفیق) 1143ھ میں مرا (مصحفی) بیدل قوم چغتا، فارسی میں بیشتر اختراعات کیے جو اہلِ محاورہ میں مقبول نہیں ہوئے۔ آسماں جاہ محمد اعظم شاہ کے ساتھ توسل تھا۔ عین سواری میں ایک دن شیر نکل آیا اعظم شاہ پر حملہ آور ہوا۔ ان کے ہاتھ سے بکری کی طرح مارا گیا۔ کلیات نظم ونثر قریب لاکھ بیت کے مشہور ہے لیکن اہل دنیا کی تعریف میں ایک مصرع نہیں کہا۔ (لطف) تاریخ ولادت (45-1644) انتخاب، 1054ھ ہے (خوشگو) اصل توران، قوم ارلات (کذا) بنگالہ میں رہتا تھا۔ تیس برس سے

شاہجہاں آباد میں ہے۔ وفات 4۔ صفر 1133ھ (آرزو) عظیم آباد میں پیدا ہوا شاہ عالم بہادر شاہ نے خان خاناں کی معرفت شاہنامہ لکھنے کی فرمائش کی۔ اس نے قبول نہ کیا۔ ہر روز ایک طاقتور گھوڑے سے کشتی کرتا تھا اور دوڑنے میں اس پر سبقت لے جاتا تھا۔ جوانی میں بھانگ اور شراب کا شوق تھا۔ بھانگ کو اوجی اور شراب کو موجی کہتا تھا (خلیل) بیدل (قدرت) جب سن امتیاز کو پہنچا تو شہزادہ اعظم شاہ کا ملازم ہوا۔ بیس برس اس روزگار میں بسر کی، اس زمانے میں بیدل تخلص کیا، شیخ عبدالعزیز عزت سے اصلاح کی ممالک بنگالہ و بہار کی سیر کی۔ پھر ہندوستان آیا۔ یہیں شادی کی۔ چھتیس برس اہل و عیال کے ساتھ اطمینان سے بسر کیے۔ چار عورتیں رکھتا تھا۔ داڑھی مونچھ نہیں تھی۔ شراب کو اوجی اور بھنگ کو موجی کہتا تھا چھتیس آثار کی لوہے کی چھڑی جسے نولاسی کہتا تھا ہاتھ میں رکھتا تھا۔ بہت خلیق، گرم جوش، نرم گفتار تھا۔ شہر کے چھوٹے بڑے اس کے گھر آتے تھے۔ شاہ عالم بہادر شاہ نے شاہنامہ لکھنے کی مکرر فرمائش کی لیکن بیدل نے اس طرف توجہ نہ کی۔ اختراع محاورہ اور تراکیب عجیب کے لیے فصحائے عجم میں مطعون تھا۔ نثر اور نظم میں ان کا کلام قریب دو لاکھ ہوگا۔ چار صفر کو رحلت کی (علی) بیدل مرزا عبدالقادر (نقش، حیدری) نام مرزا عبدالقادر، مولد صوبہ پٹنہ لیکن شاہجہاں آباد کو وطن بنایا ہے۔ اگرچہ ناصر علی کا ہم عصر تھا، اس کی وفات کے بعد پورا اعتبار پیدا کیا۔ ہندوستان بلکہ پورے ولایت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ فقیر نے ملاقات کی ہے۔ جب تک بیٹھا، شوق اور فقر سے متعلق شعر کے سوا کسی بات کا تقاضا نہ تھا۔ ان کے کلیات میں مثنوی، غزل، قصیدہ وغیرہ ہیں، اگرچہ پابس بھی ہیں لیکن ان کے رطب جگر خراش ہیں (یکجر) انسان کامل مرزا عبدالقادر بیدل، ان کی ذات مجموعۂ کمالات کے بارے میں جو کچھ لکھ دوں وہ کم ہے۔ دیوان کے علاوہ نثر میں کتاب چار عنصر بھی تصنیف کی تھی (اخلاص) بیدل، فنونِ شعر مولانا کمال سے حاصل کیے۔ مدت تک رمزی تخلص کیا۔ شروع میں شاہجہاں کے دوسرے بیٹے شاہ شجاع کی سرکار میں رہے۔ اس زمانے میں شیخ عبدالعزیز عزت اکبرآبادی سے مشقِ سخن کی۔ کچھ مدت اکبرآباد میں رہ کر دارالخلافہ جہان آباد میں آ گئے۔ کنجِ عزلت میں رہے۔ نواب شاکر خاں اور نواب شکراللہ خاں خاکسار نے شہر پناہ کے دہلی دروازہ کے باہر، گذر گھاٹ کے قریب لطف علی کی حویلی میں جو پانچ ہزار روپیہ کی خریدی تھی انھیں ٹھہرایا اور دو روپیہ یومیہ مقرر کیا جو آخر وقت تک ملتا رہا۔ عمر کے باقی چھتیس برس وہیں فراغت سے بسر کیے۔ چار شادیاں کیں۔ پینسٹھ برس کی عمر میں بیٹا پیدا ہوا جو چار برس کا ہو کر مر گیا۔ مرزا تنومند، قوی ہیکل جوان تھے۔ داڑھی مونچھ تراشتے تھے۔ کہتے ہیں ایک دن کسی خواجہ سرا نے کہا میں اپنی پگڑی رنگوانا چاہتا ہوں۔ آپ رنگ تجویز کر دیں۔ فرمایا کہ صباغ حقیقی نے تمھارے لیے دو رنگ بنائے ہیں صندلی اور بادامی۔ اپنے زمانے میں مرزا کو جو عزت و احترام حاصل تھا کسی شاعر کو میسر نہ آیا۔ قطب الملک سید عبداللہ خاں مسند سے اٹھ کر معانقہ کرتے تھے اور تکیہ و مسند چھوڑ دیتے تھے۔ نواب آصف جاہ خود کو مرزا کے شاگردوں میں گنتے تھے۔ شاہ عالم بہادر شاہ نے منعم خاں خانِ خاناں سے کہا کہ مرزا سے شاہنامہ نظم کرنے کے لیے کہو۔ خان خاناں نے پانچ چھ بار کہا تو کہا بادشاہ زبردستی چاہتے ہیں تو میں فقیر ہوں۔ جنگ نہ کروں گا، ان کے ملک سے چلا جاؤں گا۔ محمد فرخ سیر نے ملاقات چاہی۔ یہ نہ گئے۔ بادشاہ نے دو ہزار روپیہ اور ایک ہاتھی عنایت کیا۔ رقم مرزا تک پہنچی، ہاتھی کو متصدی ہضم کر گئے۔ (کچھی)

**جعفر زٹلی:**

میر محمد جعفر جو جعفر زٹلی مشہور ہے۔ زمانے کا عجوبہ، کاٹنے والی زبان رکھتا تھا۔ وضیع و شریف اسے دیکھتے ہیں تو کچھ دیتے ہیں۔ جب کسی کے گھر جاتا، دو کاغذ ساتھ رکھتا۔ ایک پر صاحب خانہ کی ہجو، دوسرے پر اس کی مدح ہوتی۔ اگر مہربانی پاتا تو مدح پڑھتا، ورنہ ہجو کے کاغذ کو شہرت دیتا چنانچہ شاہزادہ محمد اعظم شاہ کی ہجو کی ہے۔ غرض ہزل کے شعر بہت رکھتا تھا۔ نقل: ایک دن مرزا عبدالقادر بیدل کے گھر آیا۔ یہ مصرع پڑھا۔

چہ عرفی، چہ فیضی، بہ پیشِ تو پشش

مرزا بہت خفا ہوئے۔ اسے فوراً رخصت کیا (میر) میر جعفر جعفر تخلص، سید صحیح النسب، شاعری کی بنیاد ہزل پر تھی اس لیے ان کو زٹلی کہتے تھے۔ اپنی آبرو کے خیال سے اس کے ساتھ شرفا شائستگی سے پیش آتے تھے (قایم) بڑے چھوٹے ہر شخص نے اسے دیکھا ہے۔ اگر وہ کسی کی ہجو کرتا ہے تو وہ شخص اس ہجو کو اپنی مدح سمجھتا ہے۔ غرض مدح و قدح اپنے طور پر خوب کہتا تھا۔ اعظم شاہ کی مدح میں کہا ہے:

نگینِ سلیماں کہ تابندہ بود
ہمیں اسمِ اعظم دروکندہ بود

نقل، ایک دن مرزا بیدل کے پاس گیا۔ مرزا ایک مصرعے کی فکر میں تھے۔ اس نے پوچھا تو کہا کہ مصرع یہ ہے:

لالہ بر سینہ داغ چوں دارد

اس نے کہا، اس میں تامل کیا ہے۔

چو بکے سبز زیرِ کوں دارد

مرزا خفا ہوئے اور جلدی سے کچھ دے کر رخصت کیا (حسن) لقب زٹلی شاہجہاں آبادی ایک روز ایک شعر فارسی میں کہا:

مارا اگر بہ دیدنِ دُرِ یتیم نیست
نظارہ سوئے دانۂ شبنم غنیمت ست

ہمعصروں نے رشک سے کہا زٹل ہے۔ اس نے کہا اگر یہ زٹل ہے تو میں زٹل ہی کہوں گا۔ ایک روز نواب ذوالفقار خاں بہادر کے انتقال کے بعد کہا:

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
بادشاہے تسمہ کش فرخ سیر

بادشاہ ناراض ہوا اور انھیں جنت بھجوا دیا (شورش) منھ پھٹ اور شوخ مزاج، محمد اعظم شاہ بادشاہ کہتے تھے کہ اگر جعفر زٹلیات نہ کہتے تو ملک الشعرا ہوتے۔ اس کا روزمرہ کا طرز سب سے جدا ہے۔ خود اپنا نام زٹلی بتاتا ہے:

کشتی جعفر زٹلی در بھنور افتادہ است
ڈبکو ڈبکو می کند، از یک توجہ پار کن

نقل: کسی امیر کے یہاں گیا۔ اپنی حاجت لکھ کر پیش کی۔ اس نے نفرت سے عرضی کو واپس کر دیا۔ جعفر عرضی کو پارہ پارہ کر کے چلا آیا۔ کسی نے امیر کو اس کے مزاج کا حال بتایا۔ وہ ڈرا۔ جعفر کو بلوا کر معذرت کی۔ جعفر نے کہا، کیا مضایقہ، میں نے اپنا آگا دیا یعنی پیش۔ آپ نے اپنا پیچھا دیا یعنی پس۔ میں نے اس کو چاک کر دیا۔ امیر نے اس جملہ کو غنیمت جانا۔ معقول انعام دیا۔ نقل، مہاسنگ نام ایک محرر نے کسی لالچ میں جعفر کے کام میں کوتاہی کی اور حق تحریر طلب کیا۔ جعفر نے کاغذ کی پشت پر لکھ کر بھیجا:

مہا سنگ جی تم بڑی ڈینگ ہو
کرو نیکھیا بیل کے سینگ ہو
دایں جوک جیوں غوک رکھتے رہو
سکوڑوں مکوڑوں کو چکھتے رہو
نظر مت کرو سات اور پانچ پر
مبادا کہ زور آ پڑے کانچ پر

اس کے وقایع اور رقعات مشہور ہیں۔ (شفیق) ہزل کے شعر بہت ہیں (قدرت)

**سراج:**

میر سراج الدین سراج، خاکِ دکن سے ہے (گردیزی) میاں شاہ سراج اورنگ آباد میں سنے جاتے ہیں، سید حمزہ کے شاگرد ہیں۔ سید عزلت اور بیاض سے پتا چلا کہ شعر مزہ سے خالی نہیں (میر) بہت درستی سے شعر کہتا ہے (قایم) شروع میں سپاہیوں کے سلسلے میں نوکر تھا۔ اب ترکِ روزگار کر کے چند سال سے درویشی اختیار کی۔

کبھی شعرِ فارسی کی فکر کرتا ہے۔ سید صحیح النسب ہے۔ اجداد مشایخ میں تھے۔ بارہ برس کی عمر تک لکھنے پڑھنے کی قید میں رہا۔ تیرہ سال کا ہوا تو مزاج میں وحشت پیدا ہوئی۔ سات برس تک شاہ برہان الدین غریب کے روضہ میں دیوانہ کی طرح رہا۔ راتیں بے اختیاری میں کوہ و صحرا میں گزارتا تھا۔ اس کے والد سید درویش نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ ٹھیک ہوا تو فقیروں کی صحبت کا خیال ہوا، کسی صاحب کمال کی صحبت میں ترکِ لباس کیا۔ اشعار ریختہ کے شوق میں خوبصورت امردوں کا ہجوم اس کے گھر میں رہتا تھا۔ اس کے منظوروں میں ایک رسول خاں نامی تھا جس نے اس کا دیوان ریختہ مرتب کیا (قزلباش) عالمگیر اول کے زمانے میں تھا۔ روشن طبع معلوم ہوتا ہے (حسن) کچھ پہلے مرگیا، تلاشِ معنی میں استاد (تمنا) کلام میں پوری شورش ہے (مبتلا) سید حمزہ کا شاگرد (شورش، امراللہ، قدرت) سراج (ابراہیم) سلسلۂ چشتیہ سے وابستہ (افتخار) راقم سے بہت ربط ہے۔ اپنے دواوینِ فارسی کا انتخاب 1169 (56-1755) ھ میں منتخب دیوانہا کے نام سے تیار کیا۔ اس میں لکھا ہے۔ ''یہ فقیر سراج بارہ برس کی عمر سے سات سال تک لباس سے آزاد رہ کر عالمِ بیخودی میں اکثر برہان الدین غریب کے روضہ میں دن رات پڑا رہتا۔ اس مستی کے عالم میں فارسی میں شور انگیز شعر زبان سے نکلتے تھے۔ میری عمر اس لایق نہیں تھی، سننے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ پھر دل کے تقاضے سے خواجہ سید شاہ عبدالرحمن چشتی متوفی (1748) 1161ھ سے دلی ارادت پیدا کی اور ان سے ہدایت پائی۔ برادر طریقت عبدالرسول خاں کی خاطر سے ریختہ میں شعر کہے۔ پانچ ہزار شعروں سے دیوان مرتب کیا، پھر فقر کی راہ اختیار کی۔ سترہ برس سے شاعری ترک کر دی۔'' شاہ صاحب کی مثنوی ''بوستانِ خیال'' جس میں 1160 شعر ہیں دیکھے (شفیق) (64-1763) 1177ھ میں رحلت کی تاریخ ہوئی۔

سراج بزمِ ارم را نمودہ نورانی = 1177ھ (خلیل)

سراج، اورنگ آباد کے رہنے والے (حیدری) سید سراج الدین سراج اورنگ آبادی، ولی کے بعد دکن میں شعرِ ریختہ کی گرم بازاری ان سے تھی۔ مجھ سے آشنا تھے۔ تمام لوگوں سے زیادہ مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔ ''منتخب دیوانہا'' کے دیباچے میں جو (66-1765) 1179ھ میں تالیف کیا تھا اپنے حالات لکھے ہیں۔ صاحب سوز و گداز تھے۔ حضرت آزاد سے انتہائی اخلاص تھا۔ 4 شوال بروز جمعہ (1764) 1177ھ کو رحلت کی۔ میں نے تاریخ کہی

رو برحماں نمود شاہ سراج

1177

نواب خاندوراں درگاہ نے اعتراض کیا کہ رحمٰن، کے الف کا عدد شمار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ عمل کے قاعدے میں حروفِ مکتوبی معتبر ہیں، نہ کہ ملفوظی۔ میں نے نواب ہی کی ایک تاریخ سے سند پیش کر دی (یکجمی) شاہ میر سراج الدین حسینی، سراج، صحیح النسب حسینی سید ہیں۔ شاہ عبدالرحمن سے بیعت

کی ہے۔ خجستہ بنیاد میں یادِ حق میں بسر کرتے ہیں۔ ہندو دکن کے منصف ان کو افضل المتاخرین کہتے ہیں (فتوت)

**مضمون:**

مضمون، متوطن احمد آباد، وہی ایہام کا موجد ہے (حمید) کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ فرید گنج شکر کی اولاد میں ہے۔ مرزا مظہر و خان آرزو سے اصلاح لیتا ہے، کبھی تفریحاً شعر کہتا ہے۔ دیوان تمام اصناف میں قریب تین سو شعر کا دیکھا (شفیق) شیخ شرف الدین مضمون۔ ریختہ کے شعرائے قرار دادہ میں ہے مشق مظہر و آرزو سے کی ہے۔ حضرت گنج شکر کے نبایر میں ہیں۔ بڑھاپے کی سفیدی اور ضعف و ناتوانی کے باوجود نہایت گرمجوش اور چسپاں اختلاط ہیں۔ دانت نزلے سے گر گئے۔ خان آرزو مزاح سے ان کو شاعر بیدانہ کہتے تھے (گردیزی) میاں شرف الدین مضمون، نوکر پیشہ، جاجمو کا رہنے والا جو اکبرآباد کے متصل قصبہ ہے۔ مجلسوں میں ہنگامہ گرم رکھنے والا، کم گو اور بہت خوش فکر، دیوان ہر طرح سے دو سو شعروں کا ہوگا۔ شروع جوانی میں شاہجہاں آباد آئے۔ زینت المساجد میں رہے، وہیں مرے۔ خان صاحب کا شاگرد۔ فقیر میر نے اسے آخری زمانے میں دیکھا تھا۔ اتفاق سے جب میں ان کے شعروں کا انتخاب کر رہا تھا، میاں محمد حسین کلیم بیٹھے تھے اس کا یہ شعر میں نے پڑھا:

میرے پیغام کو تو اے قاصد
کہیو سب سے اسے جدا کر کر

انھوں نے کہا اگر بجائے 'پیغام کو' پیغامِ وصل کہتا تو یہ اعلا رتبہ پا لیتا (میر) مولد نواحِ گوالیار میں جاجیو ہے۔ جب عمر چالیس سے متجاوز ہوئی تو جمنا کے کنارے (زینت) المساجد میں جو زینت النسا بیگم نے بنوائی تھی قیام کیا۔ بندہ قایم دو تین مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ دس برس ہوئے کہ رحلت کی (قایم) نوکری پیشہ، جاجو وطن ہے۔ نقل ہے کہ میاں مضمون نے نواب عمدۃ الملک سے نوکری کے لیے کسی جاننے والے کی سفارش کی۔ نواب نے منظور کی۔ وہ شخص ہمیشہ حاضر رہتا تھا۔ نواب سمجھے کہ تنخواہ پا رہا ہے اور یہ کم زبان سمجھتا رہا کہ میں نوکر ہوں جب دس مہینے گزر گئے تو اس نے میاں مضمون سے کہا۔ میاں مضمون نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ کر نواب کے پاس بھیجا۔ قدر شناس نواب نے تاریخِ ملازمت سے تنخواہ کا حساب کر کے عطا کر دیا:

عرضِ حال اپنے سے ہیں اہلِ شرافت بے نصیب
نہیں سخن رکھتے زباں کے بیچ گویا یہ نجیب

آخر اسی جگہ مسجد میں فوت ہوا (حسن) فطرتاً لطیف اور ظریف تھے۔ کہتے ہیں کہ مرض الموت میں احباب جمع تھے۔ قیامت کی سختیوں کا ذکر نکل آیا۔ حالتِ نزع میں انھوں نے آنکھیں کھول کر یہ شعر پڑھا:

شورِ محشر سیتی واعظ نہ ڈرا مضمون کو
ہجر کے صدمے اٹھاتا ہے قیامت کیا ہے

اور رحلت کر گئے (امر اللہ) مضمون (مبتلا، شورش، قدرت، ہمدانی، لطف) مضمون شرف الدین، شعر اچھا کہتے تھے (حیدری)

**مظہر:**

مرزا مظہر جانِ جاناں، ان کے فارسی، ہندی شعر بلاد ہندوستان سے دکن تک زباں زد عالم ہیں (حمید) شاہجہاں آبادی۔ ہندوستان سے دکن نہیں آئے۔ اشعار فارسی، ریختۂ ہندی اور ابیات ایہامی کی فکر میں عدیم المثل ہیں۔ تمام کلام پُر درد، اور دلوں کو مرغوب ہے (قزلباش) مرزا جان جاں مظہر، اصل بخارا، مولد و منشا اکبرآباد ہے۔ بدو حیات سے آج تک کہ عمر ساٹھ کے قریب میں ہے، توکل سے بسر کرتے ہیں۔ سرِ استغنا کو بادشاہ اور وزیر کے سامنے نہیں جھکاتے ہیں۔ علم فقہ و حدیث سے بہت دلچسپی اور کتب سیر و تواریخ سے پوری واقفیت ہے۔ شعر و شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہے۔ اکثر اشعار ضائع ہو گئے۔ چونکہ عشقِ سخن ان کے آب و گل میں ہے کبھی اس شغلِ بے حاصل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں (گردیزی) باپ کا نام مرزا جان تھا، شفقتِ پدری سے مرزا جان جاناں کہتا تھا اسی نام سے موسوم ہو گئے۔ بندہ میر نے ان کی خدمت میں سعادت حاصل کی ہے۔ اکثر یادِ الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ نہایت خوش تقریر ہیں۔ فارسی کا مختصر دیوان نظر سے گزرا۔ سلیم اور کلیم سے شعر کم رتبہ نہیں ہوتے۔ ہندی شعر کہنا ان کے مرتبہ سے پست ہے، کبھی اس فن بے حاصل کی طرف توجہ کرتے ہیں اگرچہ یقیں اور حزیں جو ریختہ کے شاعر ہیں، ان کے شاگرد ہیں (میر) نازک مزاجی اور میرزائی میں انھیں نکہتِ گلشن سمجھنا بجا ہے۔ شروع جوانی میں شعر و شاعری میں مشغول تھے۔ آخر باز آئے۔ چند شعر ریختہ انعام اللہ خاں یقین کی تعلیم کے لیے موزوں کیے ہیں (قایم) عمر قریب نوّے کے پہنچی ہے۔ اس وقت سنبھل مراد آباد میں سکونت ہے۔ وہیں وعظ فرماتے ہیں۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت ہیں۔ علم کو درجۂ کمال تک پہنچایا ہے شروع میں ریختہ بھی کہتے تھے۔ خدا سلامت رکھے (حسن) مرزا مظہر (تمنا) تقلیدِ مذہب کے باوجود وسیع مشرب ہیں۔ پہلے بھی خاص طریقے سے ریختہ کہتے تھے۔ بعض تلامذہ کی تربیت کی ہے۔ کہتے ہیں کہ خود کہہ کر دیتے ہیں (آرزو) اپنے زمانے کے نادرہ گویوں میں تھے۔ علم فقہ میں اچھی دستگاہ تھی۔ فارسی میں عمدہ روش پر شعر کہتے تھے۔ اکثر ریختہ گو ان کے شاگرد ہیں۔ سنت جماعت کے مذہب کے بارے میں دل میں بہت تعصب تھا۔ لوگوں کو سید الشہدا کے تعزیہ سے منع کرتے تھے۔ سو سال عمر پائی اور اسی

ضلالت میں بسر کی۔ سنا کہ دہلی کے ساکنوں میں سے کسی نے مار ڈالا اور کردار کی سزا کو پہنچایا (مبتلا) سلسلۂ نسب محمد بن حنیفہ سے ملتا ہے۔ سید محمد بداونی نقشبندی مجددی سے بیعت کی ولادت شب جمعہ (مارچ 1702) 11 رمضان 1113ھ میں، ان کے والد مرزا جان کے ملکِ دکن سے اکبرآباد لوٹنے کے بعد مالوا کی سرزمین میں ہوئی۔ ان کے جدِ کلاں طائف سے ترکستان آئے تھے۔ وہاں کے خوانین کے ساتھ رہے۔ ان کی اولاد کے بعض افراد ہمایوں بادشاہ کی ایران سے واپسی کے وقت ہندوستان آئے اور سلاطین گورگانیہ کی رفاقت میں رہے۔ ان کے والد عالمگیر بادشاہ کے عہد میں دنیاداری سے الگ ہو گئے۔ میرزا آج کل سخنوری کے مکمل مظہر ہیں (افتخار) اب عمر نوے برس سے زیادہ ہوگی۔ یقین وحزیں جو شاعری میں سب سے آگے ہیں وہ انھیں کا فیض ہے۔ امسال کہ (جنوری 1781) 1195ھ ہے دلی کے کسی بدمعاش نے ان کو 7 یا 9 محرم کو طمنچہ کی گولی سے شہید کر دیا۔ مولوی جان محمد ناتواں کہتے تھے کہ شہادت کے بعد دوستوں نے ان کا دیوان اس نیت سے کھولا کہ سرِ صفحہ جو شعر ہو اس کو مزار پر کندہ کرایا جائے تو یہ شعر نکلا:

بلوحِ تربتم از غیب پیداست تحریرے
کہ ایں مقتول راجز بیگناہی نیست تقصیرے

(امراللہ) آج کل ریختہ کا جو طرز ہے وہ آپ ہی نے رواج دیا۔ عظیم آباد میں پہلے پہل آپ ہی کا کلام مروّج ہوا (شورش) آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ فقیر کو ملاقات کا شرف نہیں مگر خلوص غائبانہ ہے، ہمیشہ خطوط آتے جاتے ہیں۔ اپنے حالات اس طرح عنایت کیے ہیں کہ فقیر جانِ جان مظہر تخلص پسر میرزا جان تخلص جانی، نسب علوی، مولد ہندی، مسلک حنفی، مشرب نقشبندی، بارہویں صدی کے عشرہ اُولیو میں ولادت ہوئی۔ سلسلۂ نسب اٹھائیس واسطوں سے محمد بن حنیفہ کے توسط سے حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ جدِ اعلا امیر کمال الدین نویں صدی ہجری کے اوائل میں ملک طائف سے ترکستان آئے۔ ان کی اولاد میں امیر مجنوں اور امیر بابا ہمایوں بادشاہ کی فتح ہند کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ مرزا جان نے جو امیر بابا سے چھٹی اور امیر کمال الدین سے بارہویں پشت میں تھے۔ عالمگیر بادشاہ کے عہد میں ترک دنیا کیا۔ اس خاکسار مظہر نے بچپن ہی سے مال و جاہ کی پرواہ نہیں کی۔ راقم شفیق کہتا ہے کہ ان مظہر کا فضل وکمال یقین کے کلام سے ظاہر ہے (شفیق) والہ داغستانی نے ان کو سادات علوی لکھا ہے جو غلطِ محض ہے۔ یہ اتراکِ توران میں سے تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں کلاہِ درویشی پہنی نقشبندیہ مجددیہ تھے۔ امیر الامرا ذوالفقار الدولہ کی وجہ سے شاہ عالم کے زمانے میں اہلِ تشیع کو فروغ حاصل ہوا۔ یہ بزرگ متعصبانِ اہلسنت کے مقتدا کہلاتے تھے۔ اہلِ تشیع میں سے کسی متعصب نے 7 محرم 1195ھ کی رات میں طپانچہ سے زخمی کیا۔ ذوالفقار الدولہ نے بھی کہلوایا کہ آپ کے قاتل کو سزا دیں گے۔ فرنگی ڈاکٹر بھی علاج کے لیے بھیجا۔ مرزا نے کہلوایا کہ قصاص زندہ کا ہوتا ہے۔ میں خود مردہ ہوں اور اپنے طور پر علاج کرلوں گا۔ عاشورہ کے دن وفات پائی۔ مختصر دیوان ہے تاریخ ہوئی:

آہ مظہر کجائی = (جنوری 1781) 1195ھ (مصحفی)

کہتے ہیں تعصب مذہب سے تعزیہ سید الشہد اکو منع کرتے تھے، اس وجہ سے دہلی کے کسی ساکن کے ہاتھ سے (1780) 1194ھ میں جب ان کی عمر سو کے قریب تھی مقتول ہوئے (ابراہیم) کہتے ہیں 7 محرم روزِ عاشورہ کو اپنے لب بام پر بیٹھے تھے کہ روہیلوں کا کوئی سردار ان کی ملاقات کو آیا کہ ناگاہ گزرشدوں کا ان کے زیر بام ہوا۔ اس روہیلے نے کھڑے ہو کر سینہ زنی بھی کی اور موافق سلام سے ہوا۔ میرزا بیٹھے رہے بلکہ فرمایا کہ بارہ سو برس جس مقدمہ کو ہو چکے۔ ہر سال اسے زیادہ کرنا بدعت ہے اور لکڑیوں کو سلام کرنا نہایت عقل کو خفت ہے۔ یہ گفتگو بجنسہ ان لوگوں نے جو علم اور شدوں کے ساتھ تھے سنی اور مرزا کے تعصب کا ذکر امام باڑوں اور محفلوں میں دو تین شب رہا۔ آخر شب شہادت کو کہ عبارت شب چہارم عاشورہ سے ہے، کوئی شخص ان کے دروازے پر آیا اور ان کو باہر بلایا اور بے گفتگو چوٹ طمنچے کی نذر کر کے اپنے گھر کی راہ لی۔ سن ان کا قریب سو برس کے تھا 1194ھ میں سفر خلفائے راشدین کے منازل کے طریقت پر کیا (لطف) سید نور محمد بدایوں کا مرید اور محمد عابد سرہندی سے مسترشد ہے۔ یہ جباری خاں کا پوتا جو اکبر بادشاہ کے زمانہ میں چھ ہزاری منصب سے سرفراز تھا، پھر بغاوت کر کے صوبہ گجرات میں جا بیٹھا۔ قید ہوا۔ پھر قصور معاف ہوا لیکن بادشاہ نے یہ عہد کیا کہ جباری خاں کی اولاد کو پایۂ سلطنت میں جاہ مرتبہ نہ دیا جائے گا۔ ایسا نازک طبع شخص دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ یہ ناقص قدرت بھی ان کی خدمت سے مشرف ہے (قدرت) شروع میں ریختہ، آخر میں فارسی میں کہنے لگے۔ وفات (1768-69) 1182ھ میں ہوئی (خلیل) مجنوں خاں قاقشال کے پوتوں میں سے ہیں جس نے اکبر کے عہد میں بغاوت کی تھی (خوشگو) ایہام گویوں کے دور میں وہ پہلا شخص ہے جس نے ریختہ کو فارسی کے تتبع میں کہا ہے۔ میر عبدالحی تاباں پوری دوستی رکھتا تھا۔ ریختہ کی بہت غزلیں لکھیں تاباں کے کہنے سے فارسی میں کہنا شروع کیا۔ البتہ دو تین شاگردوں کی اصلاح پر توجہ ہے۔ فقیر کے عقیدے میں اس وطیرہ پر ریختہ کے نقاشِ اول مرزا ہی ہیں۔ دوسروں نے ان کی اتباع کی (ہمدانی) مظہر میرزا جان جاناں دہلوی (مجمع)

□□□

# اردو خبر نامہ

## قومی اردو کونسل کی تین کتابوں کا اجرا

● نئی دہلی، 17 اکتوبر۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے چیئرمین اور مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے قومی اردو کونسل کی تین اہم مطبوعات ''اے کورس ان اردو پرونسیئشن''، ''اردو اُچارن'' (مرتب: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ، سابق پرنسپل پبلیکیشن آفیسر قومی اردو کونسل)، ''کلیات سعادت حسن منٹو'' جلد اول (مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی اور'' کلیات سردار علی جعفری'' جلد اول و دوم (مرتب: پروفیسر علی احمد فاطمی) کا اجرا کونسل کی 23ویں ایگزیکیٹو بورڈ کی میٹنگ کے موقع پر شاستری بھون میں کیا۔ ان کتابوں کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے قومی اردو کونسل کے وائس چیرمین جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ اردو پرونسیئشن ورکشاپ موڈ میں کونسل کے ذریعے انگریزی اور ہندی میں مع سی ڈی ان لوگوں کے لیے تیار کروائی گئی ہے جو اردو سے تو واقف ہیں لیکن الفاظ کے تلفظ کی صحیح ادائیگی پر قادر نہیں ہیں۔ امید ہے کہ اردو سے شوق رکھنے والے ان کتابوں اور سی ڈی کے توسط سے اردو الفاظ کی صحیح ادائیگی پر بھی دسترس حاصل کریں گے۔ سعادت حسن منٹو جو اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں، کو ان کی 50ویں برسی پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کی تمام تحریروں کو شائع کرنے کا کونسل نے منصوبہ بنایا ہے اور یہ اس کی پہلی کڑی ہے۔ علی سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے صف اول کے شاعر ہیں جن کی شاعری کی گونج ہر سطح پر سنائی دیتی ہے۔ ان کی تمام نثری اور شعری تحریروں کو جمع کرنے نیز کلیات کی شکل میں شائع کرنے کا منصوبہ بھی کونسل نے بنایا ہے جس کے تحت اب تک دو جلدیں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ بعد ازاں کونسل کے ایجنڈے پر گفتگو ہوئی اور اردو کی ترقی اور بقا کے لیے قومی اردو کونسل نے جو مختلف تجاویز بورڈ کے سامنے غور و خوض کے لیے رکھی تھیں، ان کو منظوری دی گئی۔ ان میں ملک کے طول و عرض میں اردو مراکز کا قیام، کتابوں کی نمائش و فروغ کے لیے بیرون ملک میں اردو کے ثقافتی مرکزوں میں کونسل کی شمولیت، نیز اردو ثقافتی سینٹر قائم کرنے کی تجویزوں پر بھی غور کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اردو کتابوں کی خریداری، ان کی اشاعت پر مالی امداد اور سیمناروں کے انعقاد کے لیے اداروں اور اشخاص کی جانب سے مالی تعاون کے لیے جو درخواستیں موصول ہوئی تھیں ان پر غور و خوض کر کے انھیں منظوری دی گئی۔ اس میٹنگ کی صدارت جناب ارجن سنگھ نے کی اور اس امر پر زور دیا کہ اردو کاز کے لیے کونسل کی جانب سے جو بھی قدم اٹھائے جائیں گے، ان کو ہماری تائید حاصل رہے گی۔

قومی اردو کونسل کی ڈائرکٹر محترمہ رشمی چودھری نے میٹنگ کے اختتام پر جناب ارجن سنگھ اور دوسرے شرکا کا شکریہ ادا کیا اور امید ظاہر کی کہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے کاز میں اردو داں طبقے کا پورا تعاون حاصل رہے گا۔

## سرسید احمد خاں پر سیمینار

● علی گڑھ، 5 نومبر۔ قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین جناب محمد حامد انصاری نے کہا کہ اکیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کو چھ بڑے چیلنجوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے سرسید احمد خاں کے قوت عمل اور ان کے تجربات سے سبق حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے کہا کہ آج کے مقابلہ جاتی دور میں اگر ہم زندگی سے شکست کھا گئے تو ہم سماج میں حاشیے پر چلے جائیں گے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں ''سرسید احمد خاں کے وژن اور مشن'' پر تین روزہ عالمی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے مزید کہا کہ کسی بھی سماج کی ترقی کے لیے تعلیم کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ جناب محمد حامد انصاری نے کہا کہ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کی کوششوں سے آج سے 129 سال قبل ایم.اے.او. کالج کے قیام کے بعد سرسید کی کوششوں کا آج کتنا اثر باقی ہے اس کی جھلک ہم سچر کمیٹی کی رپورٹ کے اعداد و شمار میں دیکھ سکتے ہیں۔ آج ہمیں پھر سرسید کے مشن کی کامیابیوں اور اس کی بعض ناکامیوں کا کھلے ذہن سے تجزیہ کرنا چاہیے یا پھر آج کے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنی ضروریات کے پیش نظر خود ہندوستانی مسلمانوں کا ایجنڈا مرتب کرنا چاہیے۔ ممتاز مورخ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں سرسید احمد خاں پہلے ایسے شخص تھے جنھوں نے جدید دنیا کے مسائل کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے سائنس کو فروغ دیا اور عقل و تدبر کی بات کی اور مسلمانوں میں سائنسی مزاج پیدا کیا۔ وہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔ اس جلسے کی صدارت

کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب نسیم احمد نے کہا کہ سرسید احمد خاں چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی مدد آپ کریں۔ ان کو اپنی تحریک چلانے میں سخت مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر تحریک اپنے وقت کے تقاضوں کے ساتھ تبدیلی لاتی ہے ہمیں اپنا خود احتساب کرنا چاہیے۔ سرسید کے مشن کو جاری رکھنا آج مسلمانوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ تین روزہ بین الاقوامی سیمینار کے کنوینر پروفیسر شہاب الدین عراقی نے مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اس سیمینار میں دنیا بھر کے ماہرین حصہ لے رہے ہیں جو سرسید احمد خاں کی حیات اور ان کے کارناموں پر 50 سے زائد مقالے پیش کریں گے۔ سوشل سائنس فیکلٹی کی ڈین پروفیسر حمیدہ احمد نے مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ سرسید کی تعلیمات کا ہی فیض ہے کہ آج لڑکیاں بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہیں۔ سیمینار کے دوسرے دن پشاور یونیورسٹی، پشاور (پاکستان) کے پروفیسر آل احمد نے ''سرسید مشن کے نفسیاتی پہلو'' جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر ایس ایم عزیز الدین نے سرسید کی کتاب ''آثارالصنادید کے حوالے سے دہلی کی تاریخی عمارتوں کا جائزہ'' انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے ''سرسید اور فن تعمیر'' کامرس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر شاہ محمد وسیم نے ''سرسید کے اقتصادی نظریات'' اور ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی نے سرسید کی کتاب تبیین الکلام کے حوالے سے ان کے مذہبی افکار کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ ڈاکٹر گلفشاں خاں نے ''سرسید کے مذہبی افکار'' ممتاز مورخ پروفیسر محمد عمر نے ''سرسید اور علما'' ڈاکٹر لیاقت معینی نے ''سرسید کے مذہبی اور فلسفیانہ نظریات'' اقبال صابر نے ''سرسید اور عیسائیت'' سرسید اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر اصغر عباس نے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی معنویت'' لندن کے پروفیسر افتخار حسین ملک نے ''اسلام کے احیا میں سرسید کی کوششوں کا رول'' اور ڈاکٹر عارف الاسلام نے ''سرسید کے نظریات'' پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ کالی کٹ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر بی شیخ علی نے اس اجلاس کی صدارت کی۔

(''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

## جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یوم تاسیس پر تقریبات

● نئی دہلی، 2 نومبر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یوم تاسیس کے موقعے پر جامعہ کی مختلف فیکلٹیوں نے کئی پروگرام منعقد کیے۔ جامعہ کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام یاسر عرفات ہال میں ریسرچ اسکالرز سیمینار میں ''اردو غزل 1936 کے بعد'' ''میڈیا اور زبان'' اہم موضوعات تھے جس کی صدارت اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے کی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی جب کہ سیمینار کا افتتاح جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیرالحسن نے کیا۔

پروفیسر مشیرالحسن نے کہا کہ ہم اپنے ریسرچ اسکالروں کی آواز دور تک پہنچانا چاہتے ہیں اور ان کی علمی سرگرمیوں کا فروغ چاہتے ہیں کیونکہ اس سے جامعہ کا علمی ماحول بہتر ہوگا۔ پروفیسر قمر رئیس نے اس موقع پر اپنے خطاب میں غزل کی تاریخ اور اس کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ غزل سب سے زیادہ جمہوری، بشری اور سیکولر صنف سخن ہے۔ اس موقع پر خواجہ حسن ثانی نظامی نے جامعہ کے سابق طالب علم کی حیثیت سے خصوصی خطاب کیا۔ افتتاحی اجلاس میں عمیر منظر نے شہریار کی غزل گوئی پر مقالہ پیش کیا۔ اقبال احمد نے ٹیلی فلم اور ڈاکیومینٹری فلم کی تاریخ اور مقاصد پر روشنی ڈالی۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی اور سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا۔ سیمینار کے دوسرے اور تیسرے حصے میں مطیع اللہ (جگر مرادآبادی کی غزل گوئی) ناظمہ جبیں (عرفان صدیقی کی غزل گوئی) محمد منظر علی (آل انڈیا ریڈیو کی اردو خدمات) محمد مبشر حسین (ترسیلی زبان اور اخلاقیات) عزیز احمد (ابن انشا کی غزل گوئی) راشدہ رحمٰن (فراق کی غزل گوئی) نشاں خاتون (فیض کی غزل گوئی) اور عادل حیات نے (حسرت کی غزل گوئی) مقالے پیش کیے۔ اس موقع پر ڈائرکٹر اے. جے. کے. ایم. سی. آر. سی. ڈاکٹر افتخار احمد، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر سید عبدالباری، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر خالد محمود اور فرحت احساس وغیرہ نے شرکت کی۔

(''قومی آواز'' دہلی)

## جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو اکیڈمی کے قیام کی تجویز

● نئی دہلی، 3 اکتوبر۔ ''جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اساتذہ کو اردو کی تربیت دینے کے لیے ایک اردو اکیڈمی کا قیام کیا جائے گا۔'' اس سلسلے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیرالحسن نے ایک تجویز مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے پاس بھیجی ہے۔ جامعہ کے کیمپس میں قائم ہونے والی اس اکیڈمی میں اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ اور دیگر اساتذہ اردو زبان سے وابستہ کئی امور کی تربیت حاصل کر سکیں گے۔ مثلاً اکیڈمی میں دیگر زبانوں کی کتابوں کا اردو میں ترجمے کا کام، اردو زبان کا نصاب تیار کیا جائے گا اور ورکشاپ منعقد کی جائیں گی۔ یہ اکیڈمی یونیورسٹی کے ماتحت تو

رہے گی لیکن اسے خود مختاری کا درجہ حاصل ہوگا۔ اکیڈمی کو اردو کتب کے علاوہ دیگر زبانوں کی کتابیں بھی فراہم کرائی جائیں گی۔ یہ اکیڈمی اردو کے طلبہ کے لیے سوال نامے بھی تیار کرے گی۔ اس کے علاوہ مقابلہ جاتی امتحان کے لیے نصاب اور کتابیں بھی فراہم کرائی جائیں گی۔ یہ اکیڈمی اردو کے طلبہ کے لیے سوال نامے بھی تیار کرے گی۔ اس کے علاوہ مقابلہ جاتی امتحان کے لیے نصاب اور کتابیں بھی دستیاب کرائے گی۔ اکیڈمی خصوصی طور سے اردو میڈیم کے مختلف اسکولوں، مدرسوں اور مکتبوں کے اساتذہ سمیت پرنسپلوں اور منیجروں کے لیے بھی بیداری پروگراموں کا انعقاد کرے گی۔ اکیڈمی کے قیام کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس میں پروفیسر اختر الواقع، ایم. اختر صدیقی، زاہد حسین خاں، ایم. اسد الدین اور رخشندہ جلیل شامل ہیں۔ محترمہ رخشندہ جلیل نے بتایا کہ حال ہی میں جامعہ ملیہ نے پہلی سے گیارہویں تک کی 6 جماعتوں کے لیے این. سی. ای. آر. ٹی. کے ساتھ ایک پروجیکٹ کے تحت کتابوں کی اشاعت کرائی ہے۔

("راشٹریہ سہارا"، دہلی)

## توسیعی خطبات

● نئی دہلی، 10 اکتوبر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کی جانب سے یاسر عرفات ہال میں دو توسیعی خطبات کا انعقاد کیا گیا جن کی صدارت پروفیسر اسد علی نے کی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے زیب غوری کی شاعری پر اور پروفیسر رضوان حسین نے ایڈورڈ سعید اور سیکولر تنقید پر توسیعی خطبہ پیش کیا۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر عبید الرحمن ہاشمی نے حاضرین اور مہمانوں کا استقبال کیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے زیب غوری کی شاعری پر توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ زیب کی غزل غالب کی "ہزار شیوۂ پر پیچ" غزل کی توسیع قرار دی جا سکتی ہے کیونکہ زیب کے یہاں بھی نئی تخلیقی کائنات کی تلاش اور وسعت کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ زیب شاعر سے زیادہ مصور کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے نئی غزل کے مقبول عام راستوں اور مروجہ مضامین کے بجائے اپنی ایک الگ کائنات تخلیق کی۔ پروفیسر سید رضوان حسین نے ایڈورڈ سعید اور سیکولر تنقید کے موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ تنقیدی لفظیات میں لفظ سیکولر کی اصطلاح ہمارے لیے کس قدر نامانوس ہے مگر ایڈورڈ سعید نے اس اصطلاح کو جن معنوں میں استعمال کیا ہے، وہ مذہب کا تضاد نہیں بلکہ ماورائیت کا تضاد ہے اور اس لیے سیکولر تنقید کا اصرار ارضیت پر ہے۔ پروفیسر سید اسد علی نے مغربی ممالک کے خیالات سے ایڈورڈ سعید کے نظریاتی تصادم پر روشنی ڈالی۔ جلسے کا آغاز حافظ جہانگیر اکرم نے تلاوت کلام پاک سے کیا اور نظامت اور اظہار تشکر بزم جامعہ کی مشیر ڈاکٹر شہناز انجم نے کیا۔

("راشٹریہ سہارا"، دہلی)

## [illegible]

● پونے، 17 ستمبر۔ گیارہ جولائی کو ممبئی میں دہلا دینے والے دھماکوں کے بعد کوئی فساد نہیں ہوا۔ بلکہ ممبئی کے ہوشمند شہریوں نے امن ریلی نکال کر یہ مثبت پیغام دیا کہ وہ امن و امان کو ہر قیمت پر قائم رکھیں گے۔ اس جذبے کو مزید فروغ دینے کی غرض سے مہاراشٹر کاسموپولیٹن ایجوکیشن سوسائٹی اور لوکایت نامی تنظیم کے باہمی تعاون سے ایک سیمینار کا اہتمام بعنوان "دہشت گردی کی جڑیں: سامراجی نظام، مذہب اور سیاست" کے عنوان سے اعظم کیمپس میں کیا گیا۔ جناب منوّر پیر بھائی (چیئرمین، حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونے) نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ حالیہ دھماکوں کے پس منظر میں کارفرما قوتوں کا تاریخی، سیاسی تجزیہ اور چھان بین بے حد ضروری ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ ایسے واقعات کی نفی کرنے کے لیے بین المذاہب مذاکرات کا سلسلہ بھی شروع کرنا چاہیے۔

Now they call it Terror: Resistance in the Age of Imperialism پر ممتاز دانشور اور نیوز میگزین "فرنٹ لائن" کے کنسلٹنگ مدیر جناب اعجاز احمد نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ کویت پر امریکہ کا غلبہ اور لبنان میں اسرائیل کی در اندازی دہشت گردی کی سب سے بڑی مثالیں ہیں لیکن ان کی مذمت کرنے والا کوئی نہیں، برخلاف اس کے جب عراقی عوام اور حزب اللہ اپنی آواز بلند کرتے ہیں تو دہشت گرد کہلاتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ لبنان پر حالیہ اسرائیلی حملے کی کسی بھی عرب ملک نے مذمت تو نہیں کی البتہ حزب اللہ پر دو اغوا شدہ فوجیوں کی رہائی پر ضرور دباؤ ڈالا۔ اس کے باوجود لبنان میں آزادی کے متوالوں نے حزب اللہ کی بھرپور حمایت کرکے امریکہ اور اسرائیل کے تئیں اپنی نفرت و ناراضگی کا بھرپور اظہار کیا۔

Overcoming Barriers to Peace in South Asia: The Secular Agenda پر پرفل بدوائی، سابق ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا اور کالم نگار نے اپنے مقالے میں کہا کہ ہیروشیما پر امریکہ کی بمباری تاریخ کی سب سے بڑی دہشت گردی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اسامہ بن لادن تو دراصل امریکہ ہی کی پیداوار ہے۔

Towards a Just Solution to the Kashmir Question پر مشہور مصنف اور سماجی کارکن پروفیسر رام جیٹھانی نے گفتگو کرتے ہوئے کشمیر کی تاریخ اور مرحوم شیخ عبداللہ کی قیادت میں نیشنل کانفرنس کے سیکولر کردار پر روشنی ڈالی۔ (ڈاک سے)

## پروفیسر مجیب یادگاری خطبہ

● نئی دہلی، 31 اکتوبر۔ ہندی کے مشہور نقاد اور دانش ور پروفیسر نامور سنگھ نے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے محمد مجیب یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ بھکتی تحریک تصوف کے فیضان سے وجود میں آئی اور بھکتی شاعری میں عشق اور ہجر کے تجربات تصوف کے توسط سے ہی داخل ہوئے۔ انھوں نے اس سلسلے میں میرا بائی کا حوالہ دیا جن کی شاعری میں ہجر کے درد اور عشق کی پاداش میں سولی پر چڑھائے جانے کا ذکر صوفی علامات و روایات کے براہ راست اثر کا بین ثبوت ہے۔ انھوں نے ملک محمد جائسی کی شاعری کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے ان کی مشہور مثنوی ''پدماوت'' کا ذکر کیا اور اس میں موجود شعری اور تہذیبی رموز و علائم کا معنی خیز تجزیہ پیش کیا۔ جلسے کی صدارت جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیرالحسن نے کی۔ اس سے پہلے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر اختر الواسع نے مہمان پروفیسر کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر نامور سنگھ نے گذشتہ تین چار دہائیوں کے دوران اپنی فطری ذہانت اور علمی نظر کے ناقابل تردید نقوش قائم کیے ہیں۔

پروفیسر اختر الواسع نے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اس کے فروغ کے لیے پروفیسر محمد مجیب کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کا تعارف پیش کیا اور کہا کہ یہ ادارہ بہت جلد ''اسلام اور آدھونک پریوش'' کے نام سے ایک ہندی رسالہ بھی شائع کرنے والا ہے۔ جلسے کے آخر میں مشہور ہندی نقاد اور جامعہ کے سابق پرو وائس چانسلر پروفیسر مجیب رضوی نے اس خطبے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندی کی صوفی شاعری کی تخلیقی اور فنی خصوصیات کا ذکر کیا۔ (''عالمی سہارا''، دہلی)

## ایک شام کشور ناہید کے نام

● پنچکولہ، 2 اکتوبر۔ ہریانہ اردو اکادمی اور محکمۂ تعلقات عامہ اور ثقافتی امور، ہریانہ کی جانب سے پاکستان کی مشہور شاعرہ اور ادیبہ محترمہ کشور ناہید کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت عزت مآب ڈاکٹر اے. آر. قدوائی، گورنر ہریانہ نے کی۔ وزیر تعلیم ہریانہ جناب پھول چند مُلانا نے بطور مہمان اعزازی شرکت کی۔ تقریب میں کرنل بی. کے. این. چھبر سابق گورنر پنجاب بھی خصوصی طور پر شریک ہوئے۔

اس موقعے پر ڈاکٹر اے آر قدوائی نے محترمہ کشور ناہید کے جذبات اور خیالات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی شاعری کے حوالے سے دونوں ملکوں کے آپسی رشتوں کو مستحکم بنانے کا کام انجام دیں۔ انھوں نے موصوفہ کے کلام کی تعریف کی۔

اس موقعے پر جناب پھول چند مُلانا نے کہا کہ ہندوستان میں خواتین کے لیے مختص تعلیمی ادارے تو کام کر ہی رہے ہیں ان کے علاوہ بھی لڑکیاں مخلوط طور پر کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ مہمان شاعرہ کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کشور ناہید نے اپنی شاعری میں خواتین کے مسائل کو نہایت جدید انداز سے پیش کیا ہے۔ اپنی شاعری سے وہ جو پیغام دینا چاہتی ہیں وہ سننے والے پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔

اس سے قبل محترمہ کشور ناہید نے اپنے پُر جوش استقبال کے لیے ہریانہ اردو اکادمی اور محکمۂ تعلقات عامہ اور ثقافتی امور ہریانہ، چنڈی گڑھ اور پنچکولہ کے عوام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان سے پاکستان جب سبزیاں بھیجی جاسکتی ہیں تو ان کے درمیان کتابوں اور اخباروں کا تبادلہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے دونوں ممالک کے دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور عوام کے لیے ویزا سہولتیں دیے جانے کا خاص طور سے ذکر کیا۔ اس کے بعد موصوفہ نے اپنا کلام سامعین کی نذر کیا۔

سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی جناب کشمیری لال ذاکر نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے معاونین کا بھی شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میری کشور ناہید سے آج سولہ سال بعد ملاقات ہوئی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ پاکستان ہمارا محبتوں کا پیغام لے کر جائیں گی اور اس قسم کی تقاریب ہند و پاک کی دوریوں کو نزدیکیوں میں بدلنے کے لیے معاون ثابت ہوں گی۔

اس تقریب میں جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان میں جناب مخمور سعیدی، محترمہ نور جہاں ثروت، جناب مہندر پرتاپ چاند، جناب اشرف ساحل، جناب کشمیری لال ذاکر اور جناب شمس تبریزی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ (ڈاک سے)

## امجد اسلام امجد اور سعود عثمانی کے اعزاز میں شعری نشست

● نئی دہلی، 6 نومبر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں پاکستان کے ممتاز شاعر اور ادیب امجد اسلام امجد اور سعود عثمانی کے اعزاز میں ایک شعری محفل منعقد کی گئی۔ شعبۂ اردو کے صدر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے مہمانان کا تعارف کرایا۔ دیگر شرکا میں پروفیسر اختر الواسع، وہاج الدین علوی، خالد بن سہیل، رضا حیدر، ایم علیم، عمران احمد اور رضوان احمد وغیرہ بھی موجود تھے۔ شعری نشست میں شہپر رسول، احمد محفوظ، سرور الہدیٰ، سعود عثمانی، سردار ضیا، خالد محمود، سہیل فاروقی، کوثر مظہری اور معین شاداب نے کلام پیش کیا۔

("راشٹریہ سہارا"، دہلی)

## اردو اساتذہ کے لیے 10 فیصد نشستیں مختص کرنے کا مطالبہ

● پٹنہ، 14 اکتوبر۔ انجمن ترقی اردو، بہار، ہند کے نومنتخب صدر ایم. او. صدیقی نے کہا ہے کہ اردو کو اس کا صحیح مقام دلانا ہمارا نصب العین ہے۔ انھوں نے حکومت کی جانب سے جاری اساتذہ کے تقرر کے عمل میں اردو اساتذہ کے لیے محض 5 فیصد نشستیں مخصوص کیے جانے کی شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ اسے حسب روایت 10 فیصد کر دینا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ 25 برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اردو کو اس کا صحیح مقام نہیں ملا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ انجمن اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کرے گی۔ انھوں نے انجمن کے منصوبوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ تمام سرکاری اسکولوں میں الگ سے اردو یونٹ قائم کرنے کے سلسلے میں حکومت پر دباؤ بنایا جائے گا۔ نیز اردو اسامیوں کو اردو داں کے ذریعہ ہی پر کیے جانے پر بھی زور دیا جائے گا۔ انھوں نے اردو یونٹوں کے لیے کم از کم 10 بچوں کے حکومتی شرط کی بھی مخالفت کی۔ ان کے علاوہ بھی انھوں نے کئی منصوبوں کا اعلان کیا جو حسب ذیل ہیں:

1. اردو زبان کی ابتدائی تعلیم کے لیے انجمن پورے بہار میں بیداری مہم چلائے گی اور اس کو ایک تحریک کی شکل دے گی تاکہ اردو والے اپنی مادری زبان کی اہمیت سمجھیں اور اپنے بچوں کو اردو کی ابتدائی تعلیم یقینی طور پر دلائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے دستی مراسلے، اشتہارات اور میڈیا کے استعمال پر زور دیا۔
2. اردو کا چلن عام کرنے کے لیے اور روز مرہ کی زندگی میں اردو کے استعمال کے لیے انجمن اردو داں طبقہ سے گزارش کرے گی کہ وہ خطوط اردو میں لکھیں، دعوت نامہ اردو میں چھپوائیں، ناموں کی تختی دکانوں اور اداروں کے سائن بورڈ اردو میں لکھوائیں۔ اردو کے اخبارات و رسائل ضرور خریدیں۔
3. اردو آبادی کے لیے تعلیم بالغاں اور غیر اردو دانوں کو اردو سکھانے کے مراکز کا قیام پہلے مرحلے میں تمام ضلعی صدر دفتروں میں عمل میں لایا جائے گا۔
4. قانون اردو کے عملی نفاذ کے لیے انجمن اردو داں طبقے کو متوجہ کرے گی کہ وہ سرکاری سطح پر اردو ہی میں رابطہ کریں اور حکومت کو اپنی درخواستیں اردو ہی میں دیں۔

("راشٹریہ سہارا"، دہلی)

## کرن دیسائی کو بوکر انعام

● لندن، 12 اکتوبر۔ ہندوستانی ناول نگار کرن دیسائی کو ادب کا اہم ترین بوکر انعام پیش کیا گیا ہے۔ وہ یہ انعام حاصل کرنے والی سب سے کم عمر کی مصنفہ بن گئی ہیں۔ محترمہ دیسائی کی ماں انیتا دیسائی نے بھی کبھی یہ انعام جیتنے کا خواب دیکھا تھا۔ ان کا نام بوکر انعام کی فہرست میں تین بار شامل کیا گیا لیکن ہر بار وہ آخری دور میں باہر ہو گئیں۔ محترمہ دیسائی کی عمر 35 سال ہے۔ انھیں یہ انعام ان کے ناول "The Inheritance of Loss" کے لیے دیا گیا ہے۔ اس انعام کے تحت 50 ہزار پاؤنڈ دیے جاتے ہیں۔ محترمہ دیسائی نے یہ انعام حاصل کرنے کے بعد کہا کہ "اس ناول کی تکمیل میں میری ماں کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ محترمہ دیسائی کے اس ناول میں ایک ایسے جج کی کہانی بیان کی گئی ہے جو ریٹائر ہونے کے بعد ہمالیہ کی وادی میں واقع اپنے مکان میں سکون کی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ اس کی زندگی میں اس وقت ہلچل شروع ہوتی ہے جب اس کی یتیم پوتی اس کے پاس آتی ہے۔ اس انعام کے فاتح کا اعلان کرنے والی ٹیم کی چیئر پرسن ہرمیون لی نے کہا کہ "ہم نے ادب کے میدان میں غیر معروف مصنفین کی فہرست میں سے محترمہ دیسائی کا نام منتخب کیا اور اس کے لیے ہم نے بڑے مصنفین کے نام مسترد کر دیے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا اس کے لیے ہم نے تقریباً دو گھنٹے کا وقت لیا۔" محترمہ دیسائی سے قبل ہندوستان کی ہی اروندھتی رائے کو 1997 میں یہ انعام ملا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ایک ماہ کم 36 سال تھی۔

("قومی آواز"، دہلی)

## معصوم مرادآبادی، دوردرشن کی اعلیٰ سطحی مشاورتی کمیٹی کے رکن

● ممتاز اردو صحافی اور ادیب معصوم مرادآبادی کو دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کی اعلیٰ سطحی مشاورتی کمیٹی کا رکن نامزد کیا گیا ہے۔ قومی نشریاتی ادارے پرسار بھارتی کی طرف سے تشکیل شدہ کل ہند سطح کی اس کمیٹی میں ادب، فن ثقافت اور سماجی بہبود کے شعبوں سے 15 افراد کو منتخب کیا گیا ہے۔ کمیٹی میں ہندی زبان کی نمائندگی معروف ادیبہ مرنال پانڈے کریں گی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اس اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی میں اردو زبان کو بھی نمائندگی دی گئی ہے۔ معصوم مرادآبادی کی نمائندگی اس لحاظ سے اہم ہے کہ دوردرشن نے حال ہی میں اپنا ایک علاحدہ اردو چینل شروع کیا ہے اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی یومیہ اردو بلیٹن نشر ہوتے ہیں۔ معصوم مرادآبادی گذشتہ 25 سال سے اردو صحافت سے وابستہ ہیں اور ان کی اب تک نصف درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ دہلی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار "خبردار جدید" اور روزنامہ "جدید خبر" کے مدیر ہیں۔

(ڈاک سے)

## عالمی یوم اردو انعامات

● نئی دہلی، 22 اکتوبر۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن اور یونائٹیڈ مسلم آف انڈیا کی جانب سے عالمی یوم اردو کے سلسلے میں ایک جلسہ محفوظ الرحمٰن کی صدارت میں یہاں منعقد ہوا۔ اس میں 9 نومبر کو "عالمی یوم اردو" کے موقع پر دیے جانے والے ایوارڈ اور خطابات کا اعلان کیا گیا۔ اردو زبان کی خدمات کے اعتراف میں جن حضرات کو اعزازات اور خطابات سے سرفراز کیا جائے گا ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: (1) سہیل انجم (صحافی، دہلی) مولانا عثمان فارقلیط ایوارڈ برائے تحقیقی صحافت (2) وی کمار، مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ برائے قومی یکجہتی (3) حبیب بیگ پارس (شاعر و ادیب، جے پور) قمر واحدی ایوارڈ برائے شعری ادب (4) لوکیش کمار، قاضی عدیل عباسی ایوارڈ برائے سماجی خدمات (5) محمد عارف اقبال (مدیر، اردو بک ریویو، دہلی) مولانا محمد مسلم ایوارڈ برائے تعمیری صحافت (6) سالک دھامپوری (صحافی، دہلی) ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی ایوارڈ برائے ملی صحافت (7) شکیل اختر (نمائندہ خصوصی نوبھارت ٹائمز) منشی پریم چند ایوارڈ برائے صحافت (8) سروج خاں (سماجی کارکن، جے پور) رفیق ادب (9) ڈاکٹر راشد اللہ خاں (ممبر سی سی آئی ایم، نئی دہلی) رفیق طب (10) ڈاکٹر لال بہادر موریہ، رفیق اردو (11) سعید احمد خاں (ریٹائرڈ۔ ڈائرکٹر محکمہ نشر و اطلاعات راجستھان) رفیق صحافت (12) علامہ اقبال ٹرانی برائے برائٹ فلاورس سیکنڈری اسکول۔

("راشٹریہ سہارا"، دہلی)

## جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کتاب میلہ

● نئی دہلی۔ 31 اکتوبر کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے یوم تاسیس کے موقعے پر مختلف تہذیبی اور ثقافتی پروگراموں کے ساتھ ایک تعلیمی میلے کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، منوہر پبلی کیشن، غالب انسٹی ٹیوٹ، پرکاشن وبھاگ بھارت سرکار، نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا، ملک بک ڈپو، اردو اکادمی دہلی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، انجمن ترقی اردو ہند، فرید بک ڈپو، ساہتیہ اکادمی، اکبر بکس، پنگوئن انڈیا، اورینٹ لانگ مین جیسے اشاعتی اداروں نے حصہ لیا۔ کتاب اور ہندی کے بھی پانچ پانچ بک اسٹال لگائے گئے ہیں۔

("عالمی سہارا"، دہلی)

## بزم افسانہ

● پنچکولہ، 19 اکتوبر۔ ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے بزم افسانہ بعنوان "آؤ کہانی سنیں" کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت معروف افسانہ نگار جناب جوگندر پال نے کی اور دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ارتضیٰ کریم بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ اس موقعے پر جوگندر پال نے فن، فنکار اور قاری کے باہمی رشتے پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کہانی لکھنے والے کی طرح پڑھنے والے کے ساتھ بھی پیش آتی ہے۔ ہر کہانی کا اپنا مخصوص انداز ہوتا ہے۔ اسلوب کہانی کار کا نہیں بلکہ کہانی کا ہوتا ہے۔ آج کہانی کار کہانی مکمل نہیں کرتا بلکہ کہانی قاری کے ذہن میں ختم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے "دید اردو افسانے میں شہر کا تصور" عنوان کے تحت اپنے خیالات پیش کیے۔

اس سے قبل ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے استقبالیہ تقریر میں تمام شرکا کا تعارف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ وہ آئندہ بھی بہترین افسانہ نگاروں کو اپنے پروگراموں میں آنے کی دعوت دیں گے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا افسانہ "یاترا سے لوٹی پوتر لڑکی" پیش کیا۔

بزم افسانہ میں ڈاکٹر کیول دھیر نے افسانہ "بدچلن" جناب کیدار ناتھ شرما نے "میں صاحب نہیں ہوں" جناب موہن بھنڈاری نے "سومناتھ دا مندر" ڈاکٹر اندو بالی نے "مانو یا نہ مانو" ڈاکٹر رینو بہل نے "خوشبو میرے آنگن کی" اور ڈاکٹر فرزانہ نسیم نے "انصاف" کے عنوان سے اپنے افسانے

پیش کیے۔ جلسے کی نظامت کے فرائض جناب شمس تبریزی نے انجام دیے۔ آخر میں جناب کشمیری لال ذاکر نے تمام شرکا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

## رسم اجرا

### ترقی پسند ادب کے معمار

● کولکاتا، 3 نومبر۔ مغربی بنگال کے اسمبلی ہال میں ترقی پسند تحریک کے روحِ رواں سجاد ظہیر کے صد سالہ جشنِ ولادت کا افتتاح اسمبلی کے اسپیکر جناب ہاشم عبدالحلیم نے کیا۔ انھوں نے اس موقعے پر پروفیسر قمر رئیس کی دستاویزی کتاب "ترقی پسند ادب کے معمار" کی رونمائی بھی انجام دی۔ جلسے کی صدارت بنگال اردو اکیڈمی کے چیئرمین اور سابق وزیر محمد امین نے کی۔ ابتدا میں پروفیسر قمر رئیس نے سجاد ظہیر کے کارناموں پر کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سجاد ظہیر اور ان کے رفقا ہندوستان کی تمام زبانوں میں ایک ایسی انقلابی فکری تحریک کے معمار تھے جس کے ہمہ گیر اثرات آج بھی روشن ہیں۔ ہاشم عبدالحلیم نے کہا کہ اپنی نوعمری کے زمانے میں ہم نے سجاد ظہیر کو دیکھا تھا اور ان کے خیالات سے متاثر ہوئے تھے۔ محمد امین نے بھی سجاد ظہیر سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے "ترقی پسند ادب کے معمار" انسائیکلو پیڈیا کو ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ایک تاریخی دستاویز قرار دیا۔ اس جلسے کی نظامت سرکاری پندرہ روزہ جریدہ "مغربی بنگال" کے مدیر مصطفےٰ اکبر نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر عبدالسنان، علقمہ شبلی، قیصر شمیم، انیس رفیع اور عاصم شاہنواز بھی موجود تھے۔

(ڈاک سے)

### زہریلے انسان

● رائے پور، 30 ستمبر۔ ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد چھتیس گڑھ اردو اکیڈمی کی جانب سے کیا گیا جس میں جلگاؤں سے ڈاکٹر ایم آئی ساجد، بیاول سے جناب رحیم رضا، ناگپور سے ڈاکٹر وکیل نجیب، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، جالندھر سے شوق جالندھری، جبلپور سے آرزو صاحب اور چھتیس گڑھ کے تمام اہم شعرا نے شرکت کی۔ مشاعرے میں بمبئی سے شائع ہونے والے رسالے "شاعر" کے خصوصی شمارے کا اجرا بھی کیا گیا جس میں چھتیس گڑھ کے ادیب رونق جمال پر مدیر افتخار امام صدیقی نے گوشہ شامل کیا ہے۔ اس موقعے پر رونق جمال کے تازہ ترین افسانوں کے مجموعے "زہریلے انسان" اور رضا حیدری کی ادارت میں شائع ہونے والے سہ ماہی "شلوک" کا بھی اجرا کیا گیا۔ اس موقعے پر صدر اردو اکیڈمی محترمہ عظمیٰ اختر نائب صدر شوق جالندھری، مرزا اعجاز بیگ، ظفر رونی، وقف بورڈ کے صدر حاجی سلیم اشرفی مدرسہ بورڈ کے صدر عادل حمید خاں اور وزیر صنعت راجیش منادت بھی موجود تھے۔

(ڈاک سے)

### ترجمان اسمبلی

● پٹنہ، 18 اکتوبر۔ امیر شریعت نظام الدین نے کہا ہے کہ اردو کی ترقی کے لیے حکومت کو سب سے پہلے ذہن بنانا ہوگا اس کے بعد اس پر سنجیدگی سے منصوبہ بند طریقے سے عملی اقدامات کرنے ہوں گے۔ وہ بہار اسمبلی میں ایوان کے اردو رسالے "ترجمان اسمبلی" کے اجرا کی تقریب کی صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی ترقی کے امکانات وسیع ہیں۔ یہ تعلیمی اداروں، اخباروں اور رسائل وغیرہ سے ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس موقعے پر جنتا دل یونائیٹیڈ کے بزرگ لیڈر اور آبی وسائل کے وزیر رام آشرے پرساد سنگھ نے اپنی تقریر میں امارت شرعیہ کی خدمات کی ستائش کی۔ بہار اسمبلی کے اسپیکر اودے نارائن چودھری نے کہا کہ "ترجمان اسمبلی" کے ذریعے ایک جمہوری نظام کو مضبوط کرنے میں کافی مدد ملے گی۔ کیونکہ یہ ایک بڑے طبقے میں اسمبلی کے احساسات و جذبات کو پہنچائے گا۔ تقریب سے کونسل کے رکن پروفیسر اسلم آزاد، بھولا پرساد سنگھ اور خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر امتیاز احمد نے بھی خطاب کیا۔

("راشٹریہ سہارا"، دہلی)

### مضطر مجاز: شخصیت اور فن

● حیدر آباد، 10 ستمبر۔ حیدر آباد لٹریری فورم اور روز نامہ "منصف" حیدرآباد کی جانب سے معروف شاعر اور ادیب ڈاکٹر مقبول احمد مقبول کے تحقیقی مقالے "مضطر مجاز: شخصیت اور فن" کی رسم اجرا 7 ستمبر کو اردو ہال حمایت نگر (حیدرآباد) میں جناب منظورالامین سابق ڈائرکٹر جنرل دور درشن کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ نیشنل اردو پروفیسر ایم. ایم. تقی خاں نے جلسے کی صدارت کی۔ پروفیسر خالد سعید صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اس پر مضمون پیش کرتے ہوئے کہا کہ کتاب میں شامل مضطر مجاز کی شاعری کا عروضی و فنی جائزہ قابلِ تحسین ہے جو مصنف کی عروض و بلاغت سے گہری واقفیت کا مظہر ہے۔ پروفیسر اشرف رفیع نے کہا کہ مضطر مجاز نہ صرف

مایۂ ناز شاعر ہیں بلکہ انھوں نے اقبال اور غالب کے کلام کا منظوم ترجمہ کر کے اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ ڈاکٹر مقبول نے ان کی خدمات کا بخوبی جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر بیگ احساس نے کہا کہ یہ مقالہ مضطر صاحب کے فن کا بہترین تجزیہ پیش کرتا ہے اور ادب میں ان کا مقام متعین کرتا ہے۔ پروفیسر یوسف کمال، ڈاکٹر عالم اعظمی اور جناب ابوالفہیم وحید علی خاں ایڈیٹر ''ہمارے نونہال'' نے بھی کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔اس موقعے پر مضطر مجاز نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ سید امتیاز الدین نے جلسے کی کارروائی چلائی اور ڈاکٹر مقبول احمد مقبول نے تمام مقررین و حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

## جانے والوں کی یاد

## حیرت الہٰ آبادی

● کانپور۔ادارہ ادبی سنگم کی جانب سے ایک تعزیتی جلسہ جناب مہدی حسن حیرت الہٰ آبادی کے سانحۂ ارتحال پر زیر صدارت عشرت ظفر بر دولت کدہ جناب فاروق جائسی (سنگیتا اپارٹمنٹ، سول لائنس، کانپور) منعقد ہوئی۔ جناب ناظر صدیقی نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ جناب حیرت الہٰ آبادی ایک منفرد شاعر ہی نہیں بلکہ اعلیٰ انسانی قدروں کے حامل و امانت دار تھے۔ وہ تقسیم وطن کے بعد کراچی ہجرت کر گئے تھے اور آخر کار وہیں کی خاک میں آسودہ وآرام گیر ہوئے۔

اس موقعے پر تمام شرکا نے مرحوم حیرت الہٰ آبادی کے اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا کہ کس طرح ہر سال وہ وطن عزیز کی سرزمین کو دیکھنے اور اپنے احباب سے ملاقات کے لیے کراچی سے تشریف لاتے تھے اور ان کی آمد پر کانپور، الہٰ آباد اور فتح پور میں شعر وسخن کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ جناب حیرت الہٰ آبادی ایک درجن سے زیادہ شعری اور نثری کتابوں کے مصنف تھے۔ غزل گوئی ہی نہیں بلکہ نعت گوئی میں انھیں کمال حاصل تھا۔ علاوہ ازیں وہ ایک ادبی رسالہ ''بقلم خود'' بھی نکالتے تھے۔ جناب شاعر فتح پوری، جناب فاروق جائسی، جناب زبیر احمد فاروقی، جناب ضیا فاروقی، جناب وسیم الحسن ہاشمی، جناب ظفر احمد غازی، جناب شکیل حیدر نقوی، جناب شمشاد پرتاپ گڑھی، جناب وسیم کانپوری اور جناب شفیق فتح پوری نے بھی اس موقعے پر اظہار خیال کیا۔

## عزیز آزاد

● جودھپور۔شہر کی ادبی تنظیموں بزمِ اردو، امکان ادب اور سروکار کی جانب سے شاعر عزیز آزاد کے انتقال پر خراج عقیدت پیش کیا گیا۔تعزیتی تقریب میں مشہور شاعر جناب شین کاف نظام نے کہا کہ عزیز آزاد ہندی، اردو اور راجستھانی زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ان میں اپنے اشعار کی تنقید سننے کا شوق اور حوصلہ بھی تھا۔ بزرگ شاعر ڈاکٹر فرید آفریدی نے انھیں سچا شاعر اور زندہ دل انسان بتایا۔ راجستھان اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین اے.ڈی. راہی نے نظم ''خاموش ہوئی محفل جانے سے تیرے آزاد'' اور ماہیے، قطعات اور دوہے سنا کر انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

بزمِ اردو کے سکریٹری ڈاکٹر نثار راہی نے کہا کہ آزاد صاف گو انسان تھے۔ وہ شاعری میں کیسے کہنے کے بجائے کیا کہا گیا ہے اس پر زور دیتے تھے۔ محمد افضل جودھپوری نے کہا کہ آزاد نے نہ صرف محبت اور اتحاد کا پیغام دیا بلکہ وہ اس کے خلاف کام کرنے والی طاقتوں کو آئینہ دکھانے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ برجیش عنبر نے کہا کہ آزاد صرف اظہار کے شاعر نہ تھے بلکہ ان کے یہاں شعری خصوصیات بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ سرفراز شاکر اور امیش ساحل نے بھی انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ آغاز میں وشال پروہت نے عزیز آزاد کا مختصر تعارف پیش کیا۔ تقریب میں ساغر القادری، شیلندر پروہت، محمد مبین بھی موجود تھے۔

## شفیق دہلوی

● نئی دہلی، 7 نومبر۔ بزرگ شاعر شفیق دہلوی کا طویل علالت کے بعد گذشتہ رات انتقال ہو گیا۔ وہ 78 سال کے تھے۔ شفیق دہلوی ایک مخلص اور نیک انسان تھے ۔ ان کا تعلق احسان دانش کے خانوادے سے تھا اور وہ معروف شاعر ظفر ادیب کے شاگرد تھے۔ موصوف کے دو شعری مجموعے ''لفظوں کا سفر'' اور ''فحانۂ افکار'' بھی منظر عام پر آچکے ہیں جب کہ ان کی تیسری کتاب زیر طباعت ہے۔ ان کے پسماندگان میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ تدفین میں کئی معروف شعرا اور ادبا نے شرکت کی۔ شفیق دہلوی کے انتقال پر دہلی کے ادبی حلقوں میں گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا ہے۔

□□□

# تبصرہ وتعارف

**پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار**
**مصنف: پروفیسر قمر رئیس**
**صفحات: 424، قیمت: /152 روپے**
**ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومت ہند)، ویسٹ بلاک۔ ۱، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔ 66**
**مبصر: سورج دیو سنگھ، شعبۂ اردو، مگدھ مہیلا کالج، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔**

پروفیسر قمر رئیس کا شمار دورِ حاضر کے ان نقادوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو فکشن میں اپنی ایک الگ اور منفرد شناخت بنائی ہے۔ پریم چند کا مطالعہ اور پریم چند شناسی ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ انھوں نے پریم چند کے حوالے سے اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ ہندوستانی سماج اور معاشرے جس نبض کو پریم چند نے چھوا تھا اسے پروفیسر قمر رئیس از سرِ نو دریافت کرنے اور جانچنے پرکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار'' کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں پریم چند کے تمام ناولوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ 'سوانحی حالات' کے عنوان کے تحت مصنف نے پریم چند کے بچپن اور ابتدائی تعلیم، ملازمت اور دوسری شادی، مہوبہ اور ڈپٹی انسپکٹری، تبادلہ، مدرسی کا نیا دور، گورکھ پور کا قیام، استعفے کے بعد، بمبئی کی ملازمت، بیماری اور وفات کے ذیلی عنوان سے پریم چند کے متعلق اہم اور مستند معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح 'ذہنی اور فکری پس منظر' کے عنوان کے تحت ہندوستان کے عام اقتصادی حالات، مذہبی اور سماجی اصلاحات، قومی بیداری اور سیاسی جدوجہد وغیرہ کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔

'فن اور فکر کا ورثہ' کے عنوان کے تحت مصنف نے اردو کے ابتدائی ناول نگاروں مثلاً ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مولانا عبدالحلیم شرر اور مرزا ہادی رسوا کی ناول نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ انھی ناول نگاروں نے ناول کی سنگلاخ سرزمین کو اس قابل بنایا کہ آگے چل کر پریم چند اپنے ناولوں میں حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ پیش کر سکے۔

پریم چند کے ناولوں کے تنقیدی مطالعے کو مصنف نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ مطالعے کی یہ ترتیب پریم چند کے ناولوں کی تاریخی ترتیب سے مطابقت رکھتی ہے۔ ناولوں کے موضوعات، فنی اسالیب اور اہم کرداروں کے مطالعے کو تفصیلاً پیش کیا گیا ہے۔ 'ابتدائی دور کے ناول 1916-1903' کے زیرِ عنوان مصنف نے پریم چند کے ابتدائی دور کے ناولوں مثلاً اسرارِ معابد، ہم خرما و ہم ثواب، جلوۂ ایثار اور بیوہ پر گفتگو کی ہے۔ پریم چند کے ابتدائی دور کے ناول فکری و فنی لحاظ سے اتنے کامیاب نہیں جتنے کہ بعد کے ناول ہوئے۔ 'دوسرے دور کے ناول' میں بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، نرملا اور غبن جیسے ناولوں کو شامل کر کے ان کا فکری و فنی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس دور کے ناولوں میں فکری و فنی اعتبار سے پختگی آنی شروع ہوئی ہے۔ 'تیسرے دور کے ناول' کے تحت مصنف نے چوگانِ ہستی، پردۂ مجاز، میدانِ عمل، گئودان اور منگل سوتر جیسے ناولوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ظاہر ہے اس دور کے ناول فکری و فنی لحاظ سے بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ مذکورہ بالا ناولوں میں جاگیردارانہ اور مہاجنی تہذیب کے استحصالی رخ کی عکاسی، پولیس اور پٹواریوں کی لوٹ کھسوٹ، سرمایہ دارانہ نظام کی جھلک، غیر ملکی سامراج کے ناجائز تسلط کے خلاف احتجاج اور ملک کی آزادی کی جدوجہد کی جھلک نظر آتی ہے۔

'زبان اور طرزِ بیان' کے باب میں مصنف نے پہلا دور، دوسرا دور اور تیسرا دور کے ذیلی عنوان کے تحت پریم چند کی زبان اور طرزِ بیان پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیسے وقت اور زمانے کی مناسبت سے پریم چند کی ناول نگاری کی زبان، پیش کش اور طرزِ ادا میں تبدیلی آتی گئی۔ اس طرح 'اظہار و بیان کی خصوصیات' کے تحت مصنف نے واقعہ نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری اور ظرافت نگاری کے ذیلی عنوان سے پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیات، عمدہ مکالمہ نگاری، دلکش منظر کشی اور ان کی ظرافت نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔

'پریم چند کا تصورِ حیات'، 'پریم چند کے ہیرو' اور 'پریم چند کا مرتبہ: بحیثیت ناول نگار' وغیرہ ابواب میں پریم چند کی ناول نگاری کے پس منظر، فکر و نظر اور تصورِ فن اور فن پر کارآمد گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس طرح پریم چند گاؤں کے کسانوں، مزدوروں، محنت کشوں اور غریبوں کے دکھ درد کے سب سے بڑے نباض کہے جاتے ہیں بالکل اسی طرح پروفیسر قمر رئیس بھی پریم چند کے نباض کہے جا سکتے ہیں۔ پریم چند جن گہرائیوں میں جا کر غریب کسانوں، مزدوروں اور دیہات کے مسائل کا نقشہ اتارتے ہیں پروفیسر قمر رئیس بالکل انھی گہرائیوں میں اترتے نظر آتے ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کے ذریعے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے۔ اس کتاب کی طباعت بہت

صاف ستھری اور دیدہ زیب ہے۔ امید ہے کہ اسے قارئین کی غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوگی اور کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

**ڈیوڈ کاپرفیلڈ (جلد اول)**
**مصنف: چارلس ڈکنس**
**مترجم: فضل حسنین**
**صفحات: 516، قیمت: /256 روپے**
**ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066**
**مبصر: محمد عبدالقدیر، ڈی۔909 کریلی کالونی، الہ آباد۔211016**

حال ہی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے انگریزی کے مشہور ناول نگار چارلس ڈکنس (Charles Dickens) کے ناول "ڈیوڈ کاپرفیلڈ" (David Copperfield) کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ کونسل اردو کے کلاسیکی ادب پاروں کی تحقیق و تلاش، ان کی صحت مند اور معتبر تدوین و اشاعت سے زبان اردو کی بیش قیمت خدمت انجام دے رہی ہے۔ اب اس نے دوسری زبانوں کی مشہور زمانہ تصنیفات کے تراجم سے ان زبانوں سے ناواقف اردو والوں کے لیے ادب عالیہ کے شہ پاروں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام شروع کیا ہے جو قابل تحسین ہے اور اردو زبان و ادب کے لیے نہایت سودمند بھی۔ اس ناول کے مترجم ہیں معروف ادیب فضل حسنین جو بیک وقت ڈراما نویس، افسانہ نگار اور مزاح نگار ہیں۔

ڈیوڈ کاپرفیلڈ کے مصنف چارلس ڈکنس کا شمار دنیا کے مشہور ناول نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ اولیور ٹوسٹ (Oliver Twist)، نکولس نکل بی (Nicholas Nickleby)، ڈومبے اینڈ سن (Dombay And Son)، بلیک ہاؤس (Bleak House) اور گریٹ ایکس پیکٹیشن (Great Expectation) وغیرہ اس کے کامیاب ناول ہیں لیکن جو مقبولیت اسے "ڈیوڈ کاپرفیلڈ" سے ملی وہ بے مثال ہے۔ یہ ناول اس نے قسط وار اشاعت کے لیے لکھا تھا جو ہر ماہ اخبار کے شمارے میں چھپتا تھا۔ اس کا آزادانہ عنوان ہوتا تھا۔ (جو ناول میں باب کی شکل میں ہے) لہٰذا ہر قسط کا ایک ذیلی عنوان، ایک شروعات اور ایک خاتمہ ہوتا تھا جو مکمل ناول کا تسلسل ہوتا تھا۔ پبلشر ہر ماہ دیکھتا تھا کہ شمارے فروخت ہونے کی تعداد گھٹی یا بڑھی، جس سے وہ اس کی مقبولیت کا اندازہ لگاتا تھا۔ ناول نگار کا دوسرا مرحلہ یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے قارئین کو باندھے رکھے اور ایسا تجسس پیدا کر دے کہ وہ آئندہ شمارے کے لیے بے چینی سے منتظر رہیں۔ اس طرح اس ناول کو اس کے تکملہ سے پہلے ہی شہرت و مقبولیت مل چکی تھی۔ ڈکنس وکٹورین عہد کے کامیاب ترین اور نمائندہ ناول نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے، جس میں اس عہد کے سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی کوائف و حالات کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے۔

ڈیوڈ کاپرفیلڈ خودنوشت ناولوں کی طرح ہے۔ ناول نگار نے ایک طرف 1820 سے 1830 کے انگلینڈ اور اس کی زندگی کی عکاسی کی ہے تو دوسری طرف اس نے اپنی زندگی کے سرد و گرم، تلخ و شیریں تجربات کو بیان کیا ہے۔ مصنف نے اپنے بچپن، نوجوانی اور کہالت عمری کے تجربات کو بالخصوص والدہ کی بیوگی اور دوسری شادی، سوتیلے باپ کا رویہ، تعلیم، بورڈنگ ہاؤس میں قیام، کم عمری میں ملازمت وغیرہ کو بڑے حسن و خوبی سے صفحۂ قرطاس پر اتار دیا ہے۔ دوسرے ناول نگاروں نے بھی بچپن کا خوبصورت بیان اپنے ناولوں میں کیا ہے لیکن چونکہ ڈکنس خود اپنے تجربات کے لہو سے ناول تحریر کر رہا تھا اس لیے جذبے کی شدت اور حقیقت کی ترجمانی میں بڑی صداقت ہے۔

جارج آول (George Owell) نے بجا کہا ہے کہ:

"کسی بھی قیمت پر کسی انگریزی کے مصنف نے ڈکنس سے بہتر نہیں لکھا۔" بچوں کا انفرادی تشخص اور اس کا احساس اور خود کو ارفع (Glorify) کرنے کا جو نقشہ ڈکنس نے کھینچا ہے وہ اس سے پہلے ادب میں بچوں کے حوالے سے نامعلوم تھا۔ جب ڈیوڈ اپنے انتقال کی خبر پا کر اپنے گھر جانے لگتا ہے تو اس وقت کی کیفیت ملاحظہ کیجیے:

I am sensible of having felt that dignity is attached to me aong rest of the boys.

(مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ میرے اندر اس وقت ذرا بھی افتخار کا احساس نہ پیدا ہوا اور میں ان سب سے اسی طرح ملا جیسے کہ پہلے ملا کرتا تھا۔)

یہ ناول بچوں کے نظریے سے دنیا دیکھنے کی کوشش ہے۔ (To see world with child's view point) وہ والدہ کے غم کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ ڈکنس کا فلسفۂ غم ہم سے ہم کلام ہوتا ہے:

When I could cry no more, I began to think; and there, the oppression on my breast was heaviest and my grief, a dull pain, that there was no ease.

(جب مجھ میں رونے کی سکت نہ رہ گئی تو میں سوچنے لگا۔ میرے سینے پر غم کا پہاڑ محسوس ہونے لگا اور دل ایسا مسوسنے لگا جس کا کوئی علاج نہ تھا۔)

اس ناول میں آنسو ہیں، قہقہے ہیں، طنز ہے، مزاح ہے، فرشتے ہیں، شیطان ہیں اور قدرتی انصاف (Poetic Justice) ہے۔

فضل حسنین نے بڑی عرق ریزی سے ترجمے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ہر چند کہ کہیں کہیں پر لفظی ترجمے کی فکر میں روانی متاثر ہوتی ہے اور روح معنی لفظیات کے رکھ رکھاؤ میں گم ہو گئی ہے لیکن مجموعی طور پر مترجم ناول کے

کرداروں کو اسی تاثر کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ ڈکنس کے یہاں مواد سے زیادہ زبان اور انداز بیان پر توجہ ہے لہٰذا فضل حسنین کے ترجمے میں اس کے اصل تحریر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

اس ناول کے کامیاب ترجمے پر ہم مترجم کو اور اراکین کونسل کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے اردو کے قارئین کو انگریزی کے کلاسکی ادب سے روشناس کرایا۔ امید ہے کونسل یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھے گی۔ بہتر ہوتا اگر ابتدا میں ناول نگار کا اور کتاب کے آخر میں مترجم کا مختصر تعارف بھی پیش کر دیا جاتا۔

**اصول تعلیم/خواجہ غلام السیدین**

**صفحات: 406، قیمت:-/90روپے**

**ناشر : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066**

**مبصر: محمد امتیاز عالم، 204، ریجنسی لاج، رمنا روڈ، پٹنہ۔800004**

فن تعلیم پر خواجہ غلام السیدین کی یہ کتاب پہلی بار 1935 میں ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد نے شائع کی تھی۔ قومی اردو کونسل نے اس کا چوتھا ایڈیشن حال ہی میں شائع کیا ہے۔ ''اصول تعلیم'' ایک ایسے دور میں لکھی گئی تھی جب اردو میں فن تعلیم پر ہربرٹ اسپنسر کی کتاب کے اردو ترجمے ''فلسفۂ تعلیم'' کے علاوہ کوئی مستند کتاب دستیاب نہیں تھی۔ سر راس مسعود نے ''اصول تعلیم'' کے مقدمے میں لکھا تھا کہ ''یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کو ہم فخریہ ان مستند کتابوں کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں جو دوسرے ممالک کی زبانوں میں اس مضمون پر لکھی جا رہی ہیں۔ جہاں تک تعلیم کے اصولی مباحث کا تعلق ہے، مصنف نے ہر پیچیدہ مسئلے کو نہایت قابلیت کے ساتھ سلیس زبان میں عام فہم بنا کر ناظرین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔''

یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں تعلیم اور تمدن کے باہمی تعلق کا جائزہ لیتے ہوئے تمدن کے مختلف شعبوں سے تعلیم کے رشتے اور اس پر پڑنے والے اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس حصے میں پانچ ابواب ہیں، ''تعلیم و تمدن اور مدرسہ''، ''تعلیم اور تمدنی ادارے''، ''خانگی اور معاشی زندگی کے اثرات''، ''تعلیم اور مسئلۂ معاش'' اور ''حکومت اور تعلیم''۔ ان ابواب میں ان تعلیمی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے جو تمدنی اداروں کے مطالبات اور خصوصیات کے پیدا کردہ ہیں۔ خانگی اور درسی زندگی کا تعلق، افراد کی سیرت اور شخصیت پر اجتماعی زندگی کے اثرات، تعلیم کے میدان میں معاشی نظام کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل، تعلیم کے سلسلے میں حکومت کی ذمہ داریوں اور عوام کو کس طرح کی تعلیم دینے کی ضرورت ہے، جیسے مسائل پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے کا عنوان ''درسی تعلیم'' ہے جس کے پانچ ابواب ''علم اور زندگی''، ''مدرسۂ عمل''، ''ذہنی تربیت''، ''تدوین نصاب'' اور ''تربیت جسمانی'' کے تحت طالب علموں کی ذہنی اور جسمانی تربیت کی اہمیت اور طریقۂ کار پر گفتگو کی گئی ہے۔ طلبہ کو محض تعلیم دینا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ انھیں ابتدا سے ہی دستکاری اور دیگر مشاغل کی تربیت دینی بھی ضروری ہے تاکہ وہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکیں۔ جسمانی تربیت سے مصنف نے ان تمام جسمانی قوتوں اور امکانات کی نشو و نما مراد لی ہے جن سے ہماری ذہنی تربیت میں مدد ملتی ہے اور ہم ان تعمیری اور تخلیقی مشاغل میں شریک ہوتے ہیں جو انسان کے خلاق مزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔

تیسرے حصے کا عنوان ''اخلاقی اور معاشی تربیت'' ہے جس کے چھ ابواب میں اخلاق کا مفہوم، اخلاق اور عمل، عقلی اور اخلاقی تربیت کے تعلق، ضبط و تادیب کے جدید نظریے، معلم کی شخصیت اور اخلاقی سیرت کی تعمیر جیسے اہم موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ تعلیم کا موضوع چونکہ بچے کی ذات ہے اور اس کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں مختلف عناصر حصہ لیتے ہیں اس لیے اس حصے میں سب سے پہلے اخلاق کا حقیقی مفہوم واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پھر عمل اور اخلاق کے تعلق کے ساتھ ساتھ عقلی تربیت اور بچے کی اخلاقی تربیت میں اسکول کے ماحول کے مثبت اور منفی کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس ضمن میں نصاب، طریقۂ تعلیم، نظام ضبط و تادیب، انعام اور سزا اور استاد کی شخصیت کے اثرات کا تجزیہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اسکول اسی صورت میں بچے کی موثر اخلاقی اور معاشرتی تربیت کا مرکز بن سکتا ہے جب مذکورہ بالا امور کی تنظیم بہتر طور پر کی جائے۔ آخر میں مصنف نے اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ نظام تعلیم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد تمدنی ماحول اور تاریخی روایات پر ہو۔

امید ہے کہ ''اصول تعلیم'' کا تازہ ایڈیشن اساتذہ اور طلبہ میں یکساں مقبول ہوگا۔

**کن رجیلانی بانو**

**صفحات: 120، قیمت 195روپے**

**ناشر : اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، نمبر38، سیکٹر15، کورانگی انڈسٹریل ایریا، پی.او. باکس 8214، کراچی۔74900**

**ملنے کا پتہ: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، وائی.ایم.سی.اے. لائبریری بلڈنگ، جے سنگھ روڈ، نئی دہلی۔110001**

**مبصر: مشرف علی، 356، جہلم ہاسٹل، جے.این.یو.، نئی دہلی۔110067**

اردو فکشن میں جیلانی بانو کا اہم مقام ہے۔ ان کا تخلیقی سفر کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔ اپنی تخلیقات (افسانے، ناول ناولٹ) کے ذریعے

انھوں نے اردو کے افسانوی ادب میں بیش بہا اضافے کیے ہیں اور ان کی گراں قدر ادبی خدمات کے اعتراف میں مختلف سرکاری اداروں اور ادبی انجمنوں نے انھیں اعزازات بھی پیش کیے ہیں۔

''سکن'' جیلانی بانو کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ہے۔ مجموعے میں کل 43 افسانے شامل ہیں جن میں ابتدائی 35 افسانوں پر ایجاز و اختصار کی وجہ سے نظم کا گمان ہوتا ہے مگر مصنفہ کا کہنا ہے کہ انھوں نے ان افسانوں سے تمام غیرضروری الفاظ نکال دیے ہیں لیکن یہ نظم نہیں بلکہ افسانے ہی ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ مختصر ترین افسانے کتنی اہمیت رکھتے ہیں اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔ لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ان افسانوں کے ذریعے مصنفہ نے انسانی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات کو بخوبی اجاگر کیا ہے۔ ان افسانوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان اور دنیا کے حالات و مسائل پر جیلانی بانو کی عمیق نظر ہے۔ انھوں نے اپنے سیاسی اور سماجی شعور کی روشنی میں حالات و واقعات کا سنجیدگی سے جائزہ لیا ہے، ان کے مضمرات کو دریافت کیا ہے اور فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے حالات و مسائل، فرقہ وارانہ فسادات، مذہبی جنون پرستی، مادیت پرستی، انسانی رشتوں میں کڑواہٹ، مفاد پرستی، منافقت وغیرہ کی حقیقی تصویرکشی کے ساتھ ساتھ جیلانی بانو نے عہد حاضر کے دانشوروں، سیاسی رہنماؤں، سماجی کارکنوں اور مذہبی پیشواؤں کے اعمال و افعال کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن کے یہاں ریاکاری اور قول و عمل میں تضاد شدت سے موجود ہے۔ تیوہار کا دن، نروان، جادوگر، اسکول میں رجا کا پہلا دن، کھلونوں کی دکان پر، Care for a Girl Child، بیگم صاحب، ایماندار لوگ، نئی کالونی، سچ کی تلاش، آپ کا سواگت ہے منتری جی، او کالے برقعے والی لڑکی، بات پھولوں کی وغیرہ افسانوں میں گوناگوں سماجی اور سیاسی حالات و مسائل پیش کیے گئے ہیں۔

جیلانی بانو کے افسانوں میں عورت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے عورتوں کے ازدواجی، معاشرتی اور سماجی حالات کی روشنی میں عصر حاضر کے سماجی اور سیاسی حالات و مسائل کو سمجھنے اور پرکھنے کی سعی کی ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے عورتوں کے استحصال اور سماجی نابرابری کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں۔ مادہ جنین کشی (Female Foeticide) عصر حاضر کا ایک المناک سماجی مسئلہ ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان کی بیشتر ریاستوں میں لڑکیوں کی تعداد میں تیزی سے کمی آئی ہے۔ دنیا کا پہلا دن، Specimen Box وغیرہ افسانوں میں مصنفہ نے اس سماجی مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔ افسانہ Specimen Box کے مطالعے کے بعد یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا مستقبل میں لڑکیاں صرف Specimen Box میں ہی نظر آئیں گی؟ موجودہ صورت حال کے پیش نظر اس کا جواب بہت آسانی سے اثبات میں دیا جا سکتا تھا لیکن قدرت نے نسل آدم کی بقا اور تسلسل کے لیے عورت کے وجود کو ناگزیر بنا دیا ہے۔

عصر حاضر میں ترقی، کامیابی اور اقتدار کی ہوس کے وحشی جذبے نے انسان سے وہ سب کچھ چھین لیا ہے جس کی بنیاد پر اسے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ آج دنیا میں جوہری ہتھیاروں کے حصول کی ہوڑ لگی ہوئی ہے اور ہر ملک اس کی تباہ کاریوں سے واقف ہونے کے باوجود اسے حاصل کرنا چاہتا ہے اور موجودہ عالمی منظرنامے میں اسے اپنے ملک کی سلامتی اور تحفظ کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ ''سکن'' میں ایک خلاباز کی رپورٹ جیسے افسانے جوہری ہتھیاروں کے پس پردہ موجود تباہ کاریوں اور ہولناکیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ آج دنیا میں جتنے جوہری ہتھیار ہیں اگر انھیں ایک ساتھ استعمال کر دیا جائے تو پوری دنیا ختم ہو جائے گی۔

جیلانی بانو کے ان افسانوں میں انسانی زندگی کے تئیں مثبت رویہ پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کا کینوس مخصوص موضوعات تک محدود نہیں ہے۔ وہ عصری حالات و مسائل سے بخوبی واقف ہیں اس لیے پورا عصر اور عصری زندگی اپنی تمامتر جلوہ سامانیوں کے ساتھ ان کے افسانوں میں موجود ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کی حقیقی مثال پیش کی ہے۔

یہ مجموعہ اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، انڈیا سے دستیاب ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس جیسے بڑے ادارے نے اردو کا کام بھی شروع کیا ہے۔ امید ہے کہ پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی یہ پریس اردو کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کرے گا۔

**جی۔اے۔ کلکرنی کی کہانیاں (ترجمہ)**
**مترجم: سلام بن رزاق**
**صفحات: 271، قیمت: 250/ روپے**
**ناشر: انھیوکتی پیپر بیک، 4۔ اٹلانٹا، پلاٹ نمبر 29۔اے۔ سیکٹر نمبر 40، نیرول (مغرب) نئی ممبئی۔ 706 400**
**مبصر: مسرت بانو ابراہیم شیخ، اسمتا ملی ویو کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، بی۔ 501، نیا نگر، میرا روڈ، ضلع تھانے، مہاراشٹر۔ 107 401**

سلام بن رزاق اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ مابعد جدید افسانہ نگاروں میں ان کی حیثیت سرخیل کی ہے۔ دو سال قبل انھیں ان کے افسانوی مجموعے ''شکستہ بتوں کے درمیان'' پر ساہتیہ اکیڈمی کا باوقار انعام تفویض ہو چکا ہے۔ سلام بن رزاق ہمارے عہد کے ایک ممتاز افسانہ نگار ہی نہیں ایک معروف مترجم بھی ہیں۔ انھوں نے مراٹھی اور ہندی کے متعدد افسانوں اور ناولوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ 1998 میں انھیں ساہتیہ اکیڈمی نے

ترجمہ ایوارڈ بھی پیش کیا۔ اس لحاظ سے سلام بن رزاق نے تخلیق اور ترجمہ دونوں میدانوں میں اپنے قلم کا لوہا منوایا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ''جی.اے.کلکرنی کی کہانیاں'' میں مراٹھی کے سب سے اہم افسانہ نگار جی.اے.کلکرنی کے بارہ نمائندہ افسانوں کے اردو تراجم شامل کیے گئے ہیں۔

جی.اے.کلکرنی مراٹھی فکشن کا ایسا نام ہے جس نے مراٹھی افسانوں کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر رام پنڈت نے کتاب کے دیباچے ''حرفے چند'' میں لکھا ہے ''مراٹھی افسانے کی شناخت کے طور پر ادبی دنیا میں اگر کسی ایک افسانہ نگار کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ نام جی.اے.کلکرنی کا ہوگا۔'' سلام بن رزاق کتاب کی تقریظ میں رقم طراز ہیں: ''جی.اے.کلکرنی مراٹھی افسانے کا ایسا روشن نام ہے جن پر ماہ وسال کی گرد اثر انداز نہیں ہوتی'' اور واقعہ یہ ہے کہ قاری جب جی.اے.کلکرنی کے افسانے پڑھنے لگتا ہے تو ان افسانوں کی طلسماتی فضا، واقعات کا دروبست اور سب سے بڑھ کر افسانوں کا دلکش اسلوب اس پر کچھ ایسا جادو کر دیتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے خود کو جی.اے. کی افسانوی دنیا میں سانس لیتا محسوس کرنے لگتا ہے۔ جی.اے. کا ہر افسانہ قدم قدم پر ہمیں نہ صرف حیرت و استعجاب میں ڈالتا ہے بلکہ لمحہ لمحہ کرب واضطراب میں بھی مبتلا کرتا ہے۔ ایک کامیاب افسانے کی تعریف بھی یہی کی گئی ہے کہ وہ سلانے کے بجائے ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ جی.اے. کے افسانوں کے کردار، ماحول اور واقعات سب اسی دنیا سے مستعار ہیں۔ اس کے باوجود وہ ہمیں انوکھے معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ جی.اے. اس دنیا کو اور کاروبار دنیا کو ایسے زاویے سے دیکھتے اور دکھاتے ہیں جو ہمارے روزمرہ کے مشاہدے سے مختلف ہے اگرچہ اس انتخاب میں شامل ہر کہانی کا موضوع الگ ہے، تھیم اور پلاٹ بھی مختلف ہے، لیکن تمام کہانیوں کا بنیادی نکتہ ایک ہے۔

''قضا وقدر'' جیسا کہ سلام بن رزاق نے تقریظ میں لکھا ہے جی.اے.کا پسندیدہ موضوع ہے، یوں تو انتخاب میں شامل ہر افسانہ قاری کے ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے لیکن اہنکار، سوامی، ٹکتی، غلام، قاصد اور کیری ایسے افسانے ہیں جو اسے فکر و احساس کی ایسی کیفیتوں سے دوچار کرتے ہیں جن سے وہ پہلے آشنا نہیں تھا۔ مثال کے طور پر افسانہ 'اہنکار' جس میں بیراگی ہزاروں برس سے بہتے آبشار کو روکنے کا عزم کرتا ہے۔ بہتے آبشار کو روکنے کا خیال ہی ولولہ انگیز ہے۔ افسانے میں دکھایا گیا ہے کہ وہ چند لمحوں کے لیے آبشار کو روک بھی دیتا ہے کہیں آخر میں فطرت کی بے پناہ طاقت اس کے عزائم کو پسپا کر دیتی ہے۔ مگر موت کا لقمہ بنتے ہوئے بھی اسے اس بات کا اطمینان ہے کہ اس نے ایک لمحے کے لیے ہی سہی قدرت کے اہنکار پر ضرب لگائی تھی۔ دراصل 'اہنکار' انسان کی اسی ازلی جدوجہد کی کہانی ہے جس میں انسان قدم قدم پر قدرت کی اندھی قوتوں سے پنجہ آزمائی کرتا نظر آتا ہے۔

'قاصد' میں دکھایا گیا ہے کہ سماج میں جب بھی کسی صاحب نظر کا ظہور ہوتا ہے، روایت پسند اس کی جان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اسی موضوع کو 'باولا' میں ایک دوسرے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ 'ٹکتی' میں دکھایا گیا ہے کہ شودر ہونا ایک بددعا ہے اور شدر ہر عہد میں ناانصافی کا شکار ہوتا ہے۔

'سوامی' افسانے میں انسان کی باطنی کیفیات کو فلسفیانہ بصیرت کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ افسانے کا ہر منظر ہمیں زندگی کی ایک نئی جہت سے روشناس کراتا ہے۔

اس مجموعے کا سب سے طویل افسانہ 'کیری' ہے۔ یہ افسانہ راست بیانیہ اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ اس کہانی پر مراٹھی کے مشہور اداکار اور ہدایت کار امول پالیکر نے مراٹھی میں ایک فلم بھی بنائی ہے۔ کیری میں گاؤں کی جو منظر کشی کی گئی ہے اسے پڑھتے ہوئے کوکن کے دریا، پہاڑ، جنگل نظر کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ تائی ماوسی کے کردار میں ماں کی ممتا اور بچے کی معصومیت کا خوب صورت امتزاج نظر آتا ہے۔ اس افسانے پر مزید کچھ کہنے کی بجائے میں بزرگ ادیب یوسف ناظم صاحب کا ایک بلیغ فقرہ نقل کرنا چاہوں گی جو انھوں نے زیر نظر کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: ''جس کہانی نے مجھے اپنی گرفت میں جکڑ لیا وہ 'کیری' ہے۔ پوری کہانی میں گاؤں کی فضائیں چھائی ہوئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہانی کار نے پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر لکھی ہے اور گاؤں کے ٹوٹے پھوٹے رستوں سے اُڑنے والی دھول کو اپنے قلم کی روشنائی بنا لیا ہے۔''

مراٹھی فکشن میں جی.اے.کلکرنی کے ڈکشن کو آئیڈیل مانا جاتا ہے۔ ان کے ڈکشن میں شعر کی گہرائی اور افسانے کی وسعت گھل مل گئی ہے۔ سلام بن رزاق نے اپنے تراجم میں جی.اے. کے ڈکشن کے اسی معیار و مرتبے کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ترجمہ اس قدر شستہ بامحاورہ اور رواں دواں ہے کہ ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ فکشن کے معیاری ترجمے پڑھنے والے باذوق قارئین کے لیے یہ کتاب ایک بیش قیمت ادبی سوغات ہے۔

**بیاض (شعری مجموعہ)/عطا عابدی**

**صفحات: 176، قیمت: 150روپے**

**ملنے کا پتہ: مکتبہ افکار، بیت العطا محلہ فقیرا خاں، اردو بازار، دربھنگہ (بہار)**

**مبصر: سلیم انصاری، ایل آئی جی. II، نیو آنند نگر کالونی، ادھرتل، جبلپور (مدھیہ پردیش)**

عطا عابدی کے تازہ ترین شعری مجموعے ''بیاض'' کے مطالعے کے دوران، ان کی شاعری پر کوثر مظہری کی اس رائے سے مزید تقویت ملی کہ ''عطا عابدی کی شاعری میں زندگی کی تفہیم کے راستے ملتے ہیں، چونکہ انھوں نے حقائق زندگی

کو سمجھا ہے اس لیے ان کی غزلوں میں انحراف نہیں بلکہ خود احتسابی کا رویہ ملتا ہے جو انسان کو اصل منزل تک پہنچانے میں معاون ہوتا ہے' میرا خیال ہے کہ عطا عابدی ایک شفاف (Transparent) انسان ہیں؛ ان کی شخصیت اور شاعری کے درمیان ایک ایسے شیشے کی دیوار ہے جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں ایسے تخلیق کار بہت کم ہوں گے، جن کی شخصیات کو ان کی شاعری کے حوالے سے پورے طور پر سمجھا جا سکے۔ عطا عابدی کی شاعری بھی ان کی شخصیت کی طرح بے حد معصوم، بے ضرر اور مخلص ہے۔ ان کے یہاں زندگی کو سمجھنے کا کوئی فلسفیانہ رویہ نہیں ہے بلکہ اپنی خوشیوں، غموں، جذبوں اور رشتوں کی صداقتوں کے حوالے سے زندگی کے معنی فراہم کرنے کا عمل کارفرما نظر آتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہیں سے عطا عابدی کو تخلیقی خوراک فراہم ہوتی ہے۔

عطا عابدی زندگی سے محبت کرتے ہیں، مگر زندگی کے جبر کو قبول نہیں کرتے۔ وہ جینا چاہتے ہیں مگر زندگی کے احسان کا بوجھ اٹھا کر نہیں— وہ اپنے غموں اور زخموں سے روشنی کشید کرتے ہیں اور اسے اپنی تخلیقی کائنات کا حوالہ بنا دیتے ہیں۔ انھیں زندگی سے شکایت بھی ہے مگر وہ زندگی کے روشن اور مثبت پہلوؤں کو فراموش نہیں کرتے مختصراً یہ کہ عطا عابدی کی شاعری انسانی زندگی کے مختلف رنگوں سے عبارت ہے۔

درد پھر دل میں مکیں ہے شاید
زندگی اب بھی حسیں ہے شاید

روز آتی ہے روز جاتی ہے
زندگی ہے کسی شمار میں کیا

زخم زخم جینے کا درس دیتی رہتی ہے
زندگی سمجھتی ہے درد کا اشارہ کیا

عطا عابدی کے یہاں زندگی سے آنکھ ملا کر جینے کا ہنر موجود ہے۔ عطا عابدی نے اپنی زندگی کے مایوس ترین لمحوں میں بھی زندگی سے انحراف نہیں کیا ہے۔

غم سے بڑھ کر یہاں کوئی اپنا نہیں
اپنا غم مت کرو غم کو اپنا کرو

میں اشکوں سے ہی لیکن زندگی کے شعر لکھتا ہوں
جو کوئی دوسرا ہوتا تو اپنا مرثیہ لکھتا

زخم کے تصور کا بوجھ کتنا ہلکا ہے
روز کھلتا رہتا ہے اک گلاب ہاتھوں میں

''بیاض'' میں شامل غزلوں میں زندگی کے مختلف ابعاد ہیں۔ ان میں فکر و احساس کی وسیع کائنات آباد ہے۔ عطا عابدی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے ان کے لہجے کا دھیما پن اور اظہار کی پیچیدگیوں سے پاک سیدھا سچا اسلوب۔ غالباً یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری کو قارئین کے ایک وسیع حلقے میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی شاعری 1980 کے بعد منظر عام پر آنے والے تخلیق کاروں میں نمایاں ہے۔

اہل نظر عطا عابدی کی شاعری کو خواہ کسی بھی خانے میں رکھیں، اس سچائی سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اچھی اور سچی شاعری کو کسی ازم کی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ذہن در ذہن خوشبو کی طرح سفر کرتی ہے اور تخلیقی حوالوں کے نئے معیار مرتب کرتی ہے۔

**چیونٹی: قدرت کی ایک حیرت انگیز تخلیق**
**مصنف: ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی**
**صفحات: 98، قیمت: 30/ روپے**
**ناشر: مرکز فروغ سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ**
**مبصر: عبیدالرحمن، ایم۔2، ریگل بلڈنگ، گلی نمبر۔6، ذاکر نگر، نئی دہلی۔25**

مرکز فروغ سائنس، علی گڑھ دینی مدارس اور دیگر تعلیمی اداروں کو عام فہم زبان میں سائنس کا درسی مواد فراہم کرنے کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دے رہا ہے۔ اس کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ''چیونٹی: قدرت کی ایک حیرت انگیز تخلیق'' اسی سلسلے کی تازہ کتاب ہے۔ اس کے مصنف شمس الاسلام فاروقی علم الحشرات میں ایک طویل تدریسی و تحقیقی تجربہ رکھتے ہیں۔ موصوف ایک مدت سے سائنس کے موضوعات کو دلچسپ اور عام فہم بنا کر پیش کرتے رہے ہیں۔ ان کی نصف درجن کتابیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔

پیش نظر کتاب بظاہر معمولی اور حقیری مخلوق چیونٹی کی حیات کے اسرار و رموز کو بیان کرتی ہے۔ یہ کتاب سات ابواب میں منقسم ہے۔ اس میں تمہید کے علاوہ چیونٹیوں کی معاشرت، چیونٹیوں کا مواصلاتی نظام، چیونٹیوں کی چند مثالیں، چیونٹیوں اور دوسرے جانداروں کے تعلقات، چیونٹیوں میں دفاع اور جنگی حکمتیں اور چیونٹیوں میں بقائے نسل جیسے عنوانات شامل ہیں۔

حیوانات کی اقسام تعداد نباتات کے مقابلے میں تقریباً دوگنی ہے اور ان حیوانات میں حشرات کا تناسب تقریباً 80 فیصد ہے۔ لہٰذا ہر خطۂ زمین پر کیڑے موجود ہیں اور 25 تا 50 کروڑ سال سے کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ چیونٹیوں کی تعداد کے متعلق ماہرین کا خیال ہے کہ اس سرزمین پر انسانوں کے 40 نوزائیدہ بچوں پر 70 کروڑ چیونٹیاں موجود ہیں۔ یہ چیونٹیاں عجیب وغریب زندگی سے تعلق رکھتی ہیں جس کا صحیح اندازہ اس کتاب کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ نے ہمارے اردگرد چھوٹی بڑی اپنی بے شمار نشانیاں کیوں کر بکھیر رکھی ہیں۔

چیونٹیوں کے سوشل نظام، ان کی ذاتیں، ان کے انداز رہائش، ان کی خوراک، اپنے گروہوں کے درمیان خبروں کے تبادلے، اپنے ساتھیوں کو غذا میں شریک کرنا، لمسی مواصلت، صوتی مواصلت، برگ تراش چیونٹیاں، بنائی کرنے والی چیونٹیاں، کسان چیونٹیاں، شہد بردار چیونٹیاں، گوالن چیونٹیاں، جنگلاتی چیونٹیاں، آتشی چیونٹیاں، مخملی چیونٹیاں، اندھی یا فوجی چیونٹیاں، فوجی چیونٹیوں کے مہمان جانور، ہجرت کرنے والے چالاک کیڑے اور چیونٹیاں۔ مردہ بننے کا ڈرامہ کرنے والے کیڑے اور چیونٹیاں، پیڑ پودوں سے چیونٹیوں کا تعلق۔ چیونٹیاں پودوں کے لیے نائٹروجن کا وسیلہ، پودوں کو کھلانے والی چیونٹیاں، تیزاب پیدا کرنے والی چیونٹیاں، بم بننے والی چیونٹیاں، غلام بنانے والی چیونٹیاں، دھوکا دینے والی چیونٹیاں وغیرہ وغیرہ کتاب کے وہ کنارے ہیں جن کے اندر معلومات کا دریا رواں ہے۔

کتاب میں جابہ جا ضرورت کے مطابق بہت واضح تصاویر موجود ہیں جن کی مدد سے موضوع کو سمجھنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ یہ تصاویر بھی مصنف نے بنائی ہیں جو قابل تعریف ہیں۔ سرورق نہایت دیدہ زیب ہے۔ اتنی کم قیمت پر اتنی عمدہ کتاب کی پیش کش کے لیے ناشر قابل مبارک باد ہے۔ ایسی کتابیں اردو زبان میں خال خال نظر آتی ہیں۔ یہ عام قاری کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہے ساتھ ہی دینی مدارس اور اردو میڈیم اسکولوں کے لیے بھی انتہائی مفید ہے۔

**ماہنامہ ''آج کل''، دہلی، خصوصی شمارہ (نومبر 2006)**
**صفحات: 72، قیمت: -/7روپے**
**ناشر: پبلی کیشنز ڈویژن، 127 سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس، نئی دہلی۔**

ماہنامہ ''آج کل'' کا زیر نظر شمارہ خصوصی شمارہ ہے جس میں نومبر میں پیدا ہونے والی اردو ادب کی تین اہم شخصیات کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ یہ شخصیات ہیں علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد اور احمد ندیم قاسمی۔ گوشۂ اقبال کے تحت ''زبور عجم'' میں شامل اقبال کی دعا کے منظوم ترجمے (مترجم: رؤف خیر) اور نیاز سلطانپوری کے منظوم خراج عقیدت کے علاوہ عشرت ظفر، مشتاق احمد اور محمد ارشد کے مضامین شامل ہیں۔ گوشۂ آزاد میں ریاض الرحمٰن شروانی، پروفیسر وہاب قیصر، جمشید قمر اور حبیب عالم کے مضامین ہیں۔

عصر حاضر کے ممتاز افسانہ نگار، شاعر اور صحافی احمد ندیم قاسمی پر جو گوشہ ترتیب دیا گیا ہے اس میں نہ صرف اہم تنقیدی مضامین شامل کیے گئے ہیں بلکہ احمد ندیم قاسمی کا آخری انٹرویو، ان کا ایک بہترین افسانہ ''موت'' ایک مضمون ''انقلابی شاعری (اگست 1947 سے پہلے)'' اور شعری تخلیقات (آج کل کی فائل سے) شامل اشاعت کی گئی ہیں۔

اس گوشے میں قمر رئیس، شاہد الاسلام، زیب النسا، سیما صغیر، راشد انور راشد اور عشاق صدف کے مضامین کے علاوہ قاسمی صاحب سے افشاں ملک کا لیا ہوا آخری انٹرویو بھی شامل ہے۔ بہ اعتبار مجموعی یہ گوشہ مذکورہ تینوں شخصیات کے فکر وفن سے قارئین کو واقف کرانے کی اچھی کوشش ہے جس کے لیے شعبۂ ادارت قابل مبارکباد ہے۔

**ماہ نامہ ''ایوان اردو'' خصوصی شمارہ (نومبر 2006)**
**نگراں: پروفیسر قمر رئیس**
**مدیران: مرغوب حیدر عابدی/ڈاکٹر اسلم پرویز**
**صفحات: 82، قیمت: فی شمارہ 7/روپے/زر سالانہ 80/روپے**
**ناشر: اردو اکادمی، سی. پی. او. بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی-110006**

''ایوان اردو'' کا یہ خصوصی شمارہ پریم چند کے سترویں یوم وفات پر شائع کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں تیرہ قلم کاروں کے تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی نوعیت کے مضامین شامل ہیں۔ اس میں پروفیسر قمر رئیس (پریم چند کی روایت اور معاصر اردو فکشن) جی. کے. مانک ٹالا (سدا بہار تخلیق کار پریم چند) ڈاکٹر پردیپ جین (پریم چند اور باکمالوں کے درشن)، زبیر رضوی (پریم چند کی عصریت کے حوالے سے)، اصغر علی انجینئر (پریم چند کی تخلیقات کا جمالیاتی عنصر)، پروفیسر علی احمد فاطمی (پریم چند کیوں یاد آتے ہیں)، پروفیسر لطف الرحمٰن (پریم چند کے سیاسی نظریے)، حسین الحق (پریم چند کا موضوعاتی تنوع)، ڈاکٹر صغیر افراہیم (پریم چند کی نئی قرأت اور کفن)، ڈاکٹر ابرار رحمانی (بازار حسن سے سیوا سدن تک)، ڈاکٹر ابوبکر عباد (پریم چند اور ناول کی تنقید) اور ڈاکٹر احمد طارق (پریم چند کے چند افسانوں کے کردار) کے مضامین شامل ہیں۔ ایک مضمون ''افسانوی زبان کا جدید معیار'' سریندر چودھری کا ہے جسے محمد عمر رضا نے ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ دوسرے حصے ''نذر پریم چند'' میں سالم شجاع انصاری کا منظوم خراج عقیدت ہے اور تیسرے حصے ''پریم چند کے ادبی افکار'' میں پریم چند کے چار اہم مضامین مختصر افسانہ کا فن، ناول کا فن، ادب کی غرض و غایت اور اردو ہندی، ہندوستانی، شامل ہیں۔ چوتھا مضمون اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ پریم چند جس 'ہندوستانی' زبان کے نفاذ کی حمایت تا عمر کرتے رہے اس کے نمونے کے طور پر موصوف کی اصل تحریر پیش کی گئی ہے۔ سرورق رنگین اور جاذب نظر ہے جس پر پریم چند کی دلکش تصویر کے علاوہ ''سرو درفتہ'' کے تحت ان کے مختصر سوانحی کوائف کے ساتھ ان کی آخری تقریر کا وہ حوالہ جاتی اقتباس بھی ہے جسے انھوں نے 15 اپریل 1936 کو لکھنؤ میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں پیش کیا تھا۔

□□□

مصنف: سکنف اور سکنف
مترجم: انیس الدین ملک

بچوں کا گوشہ　　　"سائنس کی کہانیاں" (حصہ اوّل) سے ماخوذ

# اوّلین غبارے

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ذیل میں "سائنس کی کہانیاں" سے ایک مضمون پیش کیا جارہا ہے۔

بچے فطرتاً تجسس پسند ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آس پاس کی ہر شے کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اس کتاب میں ایسے مختلف موضوعات پر تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ چند عنوانات درج ذیل ہیں۔ کانچ بنانے کا فن، قلوپطرہ نے ایک موتی گھولا، راہب اور بارود، بارود اور ایک آتش فشاں پہاڑ، ایپسم نمک، اتفاقی رنگ، دھوئیں سے روشنی، پادری، سوڈاواٹر اور چوہے۔152 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 18 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45 فیصد اور اساتذہ کو 40 فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

اسٹیفن اور جوزف مونٹ گولفیر دو بھائی تھے جو انویان میں ایک بڑے کاغذ کی فیکٹری کے مالک تھے۔ انویان دریائے رہوں کے کنارے ایک قصبہ تھا۔ دونوں بھائیوں کو اڑان سے متعلق مطالعے سے دلچسپی تھی۔

ان کو معلوم تھا کہ اگر کاغذ کے بڑے تھیلے کو بھاپ سے بھر دیا جائے جو اتنا ہلکا ہو جتنا بادل تو یہ بادل کی مانند ہوا میں تیرے گا۔ پانچ جولائی 1783 کو ایک بڑی بھیڑ ان دونوں بھائیوں کے تصور کو عملی تجربہ کی شکل میں دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوئی۔ ایک گولے کی شکل میں 35 فٹ قطر کے کاغذ کے تھیلے کو ایک بڑی نلی کے اوپری سرے پر باندھ دیا گیا اور تھیلے کے کھلے منہ کے نیچے لکڑی اور بھوسے کا ڈھیر رکھا گیا۔ اس ڈھیر کو آگ لگا دی گئی جس کے نتیجے میں دھواں تھیلے میں پھیل کر اوپر پورے گولے میں بھر گیا۔ اس تھیلے کو آزاد چھوڑ دینے پر یہ تیزی سے ہوا میں اوپر کی طرف اٹھا اور دس منٹ سے کم عرصہ میں یہ چھ ہزار فٹ کی اونچائی تک چلا گیا۔ لیکن جلد ہی یہ نیچے کی طرف آنے لگا اور آخر میں ایک انگور کے باغ میں اتر گیا۔

پروفیسر چارلس نے جو ایک ممتاز فرانسیسی سائنسداں تھا، اس غیر معمولی تجربے کے بارے میں سنا اور ایک اہم تبدیلی کے ساتھ اس کو دوہرانے کا فیصلہ کیا۔ اسے اس بات کا علم تھا کہ برطانوی سائنسداں کیونڈش کا کہنا ہے کہ نئی دریافت کی ہوئی گیس جسے اب ہائیڈروجن کہتے ہیں، ہوا سے دس گنا ہلکی ہے (اصلیت میں یہ 17½ گنا ہلکی ہے)۔ اس لیے چارلس نے گرم ہوا اور دھواں بھرنے کے بجائے ہائیڈروجن گیس استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانے میں ہائیڈروجن کو لوہے اور گندھک کے ہلکے تیزاب کے عمل سے بناتے تھے۔

چارلس نے اپنے منصوبوں کا اعلان کیا اور عوام سے ضروری اشیا خریدنے کے لیے چندہ مانگا۔ دو بھائی جن کا نام روبرٹس تھا۔ انھوں نے ریشم کا ایک کرہ بنایا جس کا قطر تقریباً 13 فٹ تھا اور اسے گیس کو روک بنانے کے لیے اس کے اندر گوند کا روغن کر دیا۔ ہائیڈروجن کو ایک ہزار پونڈ لوہا اور پانچ سو پونڈ گندھک کا تیزاب ملا کر بنایا گیا۔ ان کو ایک برتن میں جو خصوصی طور سے اس مقصد کے لیے بنایا گیا تھا رکھا، گیا۔ اس برتن سے پائپ کو تھیلے کے منہ کی طرف لے جایا گیا۔ اس ریشم کے تھیلے کو بیلون کہا گیا۔

اس تجربے نے بہت سارے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور لوگ 23 اگست کو غبار بھرتے ہوئے دیکھنے آئے۔ بھیڑ اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ غبارے کو ایک کھلی جگہ چیپ ڈی مارس جو دو میل دور تھا، لے جایا گیا۔ وہاں اسے خفیہ طور سے لے جایا گیا۔ ایک چشم دید گواہ نے اسے ہٹانے اور لے جانے کا واقعہ بیان کیا ہے۔

غبارے کو لے جانے کا منظر ایسا تھا کہ کوئی اس سے زیادہ حیرت انگیز منظر تصور میں نہیں آسکتا۔ آدمی جلتی ہوئی مشعلوں کے ساتھ چل رہے تھے اور پیادہ سپاہیوں کا دستہ اور گھوڑ سوار بھی ساتھ ساتھ تھے۔ رات کا یہ مارچ ریشم

کے کرہ کی شکل اور جسامت جسے اتنی حفاظت سے لے جایا جا رہا تھا، خاموشی جو اس وقت طاری تھی اور یہ نامناسب وقت —— یہ سب ان لوگوں پر جو اس کی حقیقت سے ناواقف تھے، ایک غیر معمولی پر اسرار اثرات ڈال رہے تھے۔ جب جلوس گزر رہا تھا تو کوچوانوں نے سڑک پر متحیر ہو کر اپنی بگھی روک لی اور ٹوپی اپنے ہاتھ میں لے کر عاجزی کے ساتھ جھک گئے۔

دوسرے دن اڑان کے میدان میں لوگوں کی اتنی زیادہ بھیڑ تھی کہ فوج کی ایک بڑی تعداد کو جھگڑے فساد کو روکنے کے لیے بلایا گیا۔ سہ پہر کو پانچ بجے توپ سے گولہ داغ کر اشارہ دیا گیا۔ رسیاں جو کہ کرہ کو باندھے ہوئے تھیں کاٹ دی گئیں۔ یہ اوپر کی جانب اٹھا اور دو منٹ سے کم وقت میں تقریباً تین ہزار فٹ اوپر اٹھ گیا۔ وہ ایک بادل میں جا گھسا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پھر نظر آیا۔ پھر اور زیادہ اونچائی پر جانے لگا اور آخرکار بھاری بارش میں دوسرے بادلوں میں کھو گیا۔ فضائے بسیط میں ایک شے کا چلنا اتنا پر لطف تھا اور یہ روزمرہ کے نظاروں سے اتنا مختلف تھا کہ تماشائی جوش کے مارے آپے سے باہر تھے۔ لوگ اتنے زیادہ بے قرار تھے کہ عورتیں، جنھوں نے جدید فیشن کے کپڑے پہن رکھے تھے، اپنے آپ کو بارش میں بھیگنے دیا تاکہ کرہ کو آخری لمحے تک دیکھتی رہیں۔

اس غبارے سے بندھا ہوا ایک چمڑے کا تھیلا تھا جس میں ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ اس میں اڑنے کا دن اور وقت لکھا ہوا تھا اور یہ درخواست کی گئی تھی کہ اگر یہ کسی کو ملے تو یہ پروفیسر چارلس کو واپس کر دیا جائے۔

چارلس کا خیال تھا کہ اس نے اتنی مقدار میں ہائیڈروجن بھری کہ جو غبارے کے لیے ہوا میں 20 سے 25 دن تک ہوا میں اُڑنے کے لیے کافی ہوگی۔ لیکن تین چوتھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد غبارہ پیرس سے پندرہ میل دور گونیسے گاؤں میں ایک کھیت میں جا گرا۔ غبارہ تقریباً 20 ہزار فٹ کی اونچائی تک گیا اور اس اونچائی پر باہر کی ہوا کا دباؤ اندر بھری ہائیڈروجن سے بہت کم تھا اس لیے ہائیڈروجن کے زیادہ دباؤ نے کپڑے کو پھاڑ دیا اور غبارہ زمین پر اسی لیے گرا کیونکہ سوراخ سے گیس نکل گئی۔

اخبار کی مندرجہ ذیل اطلاع کے مطابق دیہاتی اس عجیب و غریب شے کو آسمان سے گرتا دیکھ کر خوف سے سہم گئے:

''اس کو دو کسانوں نے گرتا دیکھا اور وہ سمجھے کہ آسمان سے اڑتا ہوا ایک دیو نیچے اُتر رہا تھا۔ اس خیال کو اور بھی زیادہ تقویت ملی جب غبارے نے گرنے کی تیز رفتار کی وجہ سے زمین پر ساکت ہونے سے قبل کئی بار جھٹکا کھایا۔ ان حرکات نے کسانوں کو یہ یقین دلا دیا کہ یہ ایک حیوان تھا، جو زندہ تھا۔ اس لیے ان کی اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اور وہ کچھ دیر تک کھڑے ہو کر اس پر پتھر پھینکتے رہے۔ اس طرح جب انھوں نے ریشم کے کرہ کو پوری طرح سے پھاڑ دیا تو غبارہ بالکل ساکت ہو گیا۔ تب ان دونوں میں سے ایک زیادہ ہمت والا آگے بڑھا اور تعجب سے دیکھا کہ حیوان نے اپنے جبڑے کھول دیے ہیں۔ اس نے دیو کے دانتوں کے خیال سے ڈر کر اس کے منہ میں اپنا ہاتھ ڈالنا خطرے سے خالی نہیں سمجھا۔ اس نے احتیاط سے جھانک کر ہی اپنے کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہائیڈروجن (جو خالص نہیں تھی) کی بدبو ابھی منتشر نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کو اپنا سر پیچھے ہٹانا پڑا۔ اس کے ساتھی نے اس کو دیکھا اور یہ سمجھ کر کہ حیوان نے اس کو کاٹ لیا ہے، تیزی سے دور بھاگنے لگا۔ لیکن دوسرا آدمی چلایا اور یہ بتایا کہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے اور حیوان مر چکا ہے لیکن بدبو سے سڑ رہا ہے۔ اب ان کی ہمت بندھی اور انھوں نے غبارے کو قریب ہی چرتے ہوئے ایک خچر کی دُم سے باندھا اور گھسیٹتے ہوئے گاؤں کی طرف لے چلے۔ وہ پادری کے دروازے پر رُکے اور اس قابل تعظیم بزرگ سے درخواست کی کہ وہ اس جادو کے حیوان کا مطالعہ کریں۔ اُس نے چمڑے کے تھیلے کو دریافت کر لیا اور اس کے اندر رکھے ہوئے کاغذ کو پڑھا جس میں غبارہ بنانے والے کا نام، اس کا مقصد اور کس کو یہ بھیجا ہے، اس کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ دونوں کسان بہت خوش ہوئے، انھیں امید تھی کہ انھیں اس محنت اور خطرناک کام کا انعام ملے گا۔''

اس سلسلے میں ایک اور بیان دیہاتیوں کے متحیر ہونے کے بارے میں ہے:

''پہلی نظر میں بہت سے لوگوں کے خیال میں یہ کسی دوسری دنیا سے آئی اور دوسرے جو کہ زیادہ فہیم تھے، ان کے خیال میں یہ کوئی دیونما چڑیا تھی۔ جب یہ اُتری تو اس میں گیس ہونے کی وجہ سے حرکت تھی۔ کچھ لوگوں نے ہمت کی اور ایک گھنٹے تک آہستہ آہستہ آگے بڑھے، اس امید پر کہ دیو پرواز کرے گا۔ آخرکار ان میں سب سے زیادہ ہمت والے آدمی نے بندوق سنبھالی اور اس کے کافی قریب آ کر اس پر گولی چلائی اور دیو کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور اپنی فتح مندی پر چلایا۔ بھیڑ ہیلی فورک کے ساتھ آگے بڑھی۔ ایک نے کھال سمجھ کر اسے چھپایا۔ زہریلی بدبو سونگھی اور سارے لوگ ہٹ گئے۔ انھوں نے غبارے کو گھوڑے کی دم میں باندھا اور گھوڑا قلانچے مارتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھا اور اس کی دھجیاں ہو گئیں۔

مشہور امریکی سائنسداں اور سیاستداں فرینکلن جس نے غبارے کی پہلی اڑان دیکھی تھی، نے غبارے کو جنگ میں استعمال کرنے کے امکان پر غور کیا۔ اس نے لکھا:

پانچ ہزار غبارے جن میں سے ہر ایک دو آدمیوں کو لے جا سکے، قیمت میں پانچ جہازوں سے زیادہ نہیں پڑیں گے اور کہاں ہے وہ بادشاہ جو اپنے ملک کے تحفظ کے لیے اتنے فوجیوں کا انتظام کر سکے جو بادلوں سے اُترے

ہوئے دس ہزار آدمیوں کا مقابلہ کرسکیں۔

پس اس نے جنگ میں ہیرا ٹروپ کے استعمال کی 150 سال قبل ہی پیش گوئی کر دی تھی۔

کچھ فرانسیسی پریشان تھے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ انگلستان جو ہمارا رقیب ہے، سمندر پر برتری حاصل کرنے کی طرح ہوا میں بھی ہم سے پہلے سبقت لے جائے گا۔ لیکن انگلستان کے لوگوں کو خدشہ تھا کہ اس پر حملے کے خلاف جو قدرتی پشت پناہ انگلش چینل کی ہے، اب دشمن کو ان کے ساحلوں پر پہنچنے سے نہیں روک سکے گی۔ ایک مشہور کارٹون 1784 میں کھینچا گیا جس کا عنوان تھا ''مونگولفیر بادلوں میں۔'' اس میں دکھایا گیا تھا کہ فرانسیسی موجد پھونک کر صابن کے بلبلے نکال رہا ہے جو غباروں کو ظاہر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے:

''خدا کی قسم یہ ایک زبردست ایجاد ہے۔ یہ میرے بادشاہ کو، مجھے اور میرے ملک کو غیر فانی کر دے گی۔ ہم اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیں گے۔ خدا کی قسم ہم ان کو ہلا دیں گے۔ ہم ان کی چھاؤنیوں کا معائنہ کریں گے اور ان کے جنگی جہازوں کے بیڑے کو راستے میں روک لیں گے۔ ہم ان کی بندرگاہوں کو آگ لگا دیں گے۔ خدا کی قسم ہم جبرالٹر لے لیں گے۔ ہوا کے غباروں سے ہم نہ صرف انگلستان بلکہ دوسرے ممالک بھی فتح کر لیں گے۔ اور ان کو بادشاہ سلامت کی نوآبادیاں بنالیں گے۔''

کچھ سال بعد 1792 میں اولین غباروں کی پرواز کا ایک دلچسپ طور سے خاتمہ ہوا۔ اس وقت فرانسیسی اپنے بادشاہ کے خلاف پوری طرح سے بغاوت برپا کر چکے تھے اور دس اگست کے یادگاری دن پیرس کے باشندے پوری طرح سے بادشاہ کی ماتحتی سے آزاد ہو گئے۔ انھوں نے شاہی محل پر حملہ کر دیا اور بادشاہ کے محافظ سپاہیوں کو قتل کر دیا اور اخیر میں بادشاہ کو قیدی بنا لیا۔ اس کو جیل میں بند کر دیا گیا اور عدالتی تحقیقات کے بعد اس کو موت کی سزا ملی اور جلاد مشین سے سر اڑا دیا گیا۔

اس یادگاری دن پروفیسر چارلس شاہی محل میں تھا کیونکہ بادشاہ نے اسے اس کے سائنسی کارنامے کے بدلے میں انعام و اکرام کے ساتھ مفت شاہی رہائش بخشی تھی۔ مجمع محل میں گھس کر ہر خاص و عام کا قتل کرنے لگا اور کچھ لوگوں کے ہاتھ چارلس آگیا۔ وہ اس کو مارنے ہی والے تھے کہ اس نے ان کو یاد دلایا کہ وہ چند سال قبل اس کے غباروں کی پرواز دیکھ کر محظوظ ہوئے تھے۔ مجمع میں سے کچھ لوگوں نے اسے پہچان لیا اور اس کی جان بخش دی۔ وہ انقلاب کے دور سے سلامتی کے ساتھ گزرا اور 1823 تک زندہ رہا۔

فرینکلن نے ہیرا ٹروپ کے استعمال کی پیش گوئی کی تھی۔ ہوا میں لڑائی کی جھلک اس کے تھوڑے ہی دن بعد دیکھنے میں آئی جب 1808 میں دو آدمی پہلی بار مقابلہ آور ہوئے۔ انھیں معلوم تھا کہ پہلی بار لڑنے میں بھی کسی ایسے ہتھیار کا جس سے صرف ایک بار نشانہ داغا جا سکے گا، استعمال بیکار ہے۔ اس لیے دونوں کے پاس بڑے منہ کی چھوٹی بندوقیں تھیں جن کی ایک بار لبلبی دبانے سے کئی گولیاں نکلتی تھیں۔ دونوں جنگِ عظیم میں مشین گنیں استعمال کی گئی تھیں جو بے شمار گولیاں ہوا میں دور تک بوچھار کرتی تھیں تاکہ ان میں سے کم سے کم ایک نہایت اہم مقام پر لگ سکے۔

دو آدمی ایم ڈی گرانڈ پیرے اور ایم لا پی کی ایک ایکٹریس پر لڑ پڑے، جیسا کہ اس زمانے کا دستور تھا۔ اس طرح کے معاملے کا فیصلہ ایک ڈوئل کے ذریعے ہوتا تھا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ دو بالکل یکساں غبارے میں بیٹھ کر ہوا میں ڈوئل لڑ جائے۔ اس سلسلے میں جب ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ہر ایک ڈوئل لڑنے والا اپنے ڈبل کے ساتھ غبارے کے لٹکن میں بیٹھ گیا۔ دونوں غباروں کو اس طرح رکھا گیا کہ اڑنے پر ان کا فاصلہ 80 گز کے قریب ہو۔ ایک بڑے مجمع کی موجودگی میں دونوں غباروں کو اڑایا گیا۔ جب غبارے کافی بلندی پر پہنچ گئے تو بندوق سے گولی چلانے کا اشارہ کیا گیا۔ ایم لا پی نے پہلی گولی داغی لیکن نشانہ خطا کر گیا۔ اس کے بعد ایم ڈی گرانڈ ہیرے نے دوسرے غبارے پر فائر کیا اور وہ نشانے پر لگا۔ غبارہ پھٹ گیا اور اس کے نیچے بیٹھنے کا لٹکن گر گیا۔ اس کے گرنے کی رفتار زمین پر پہنچتے پہنچتے بہت تیز ہو گئی اور یہ زمین سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ ایم لا پی اور ان کے ڈبل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور ایم ڈی گرانڈ پیرے اور ان کا ڈبل ہوا میں اس وقت تک اڑتے رہے۔ جب تک کہ غبارہ پیرس سے 20 میل دور زمین پر نہ آ گیا۔

سائنس دانوں کو جلد ہی یہ انکشاف ہوا کہ غباروں کے استعمال سے فضا کے اوپری حصے کا مطالعہ ہو سکے گا۔

1804 میں دو فرانسیسی سائنس داں بہت سے سائنسی آلات کے ساتھ یہ دریافت کرنے کے لیے ایک غبارے میں بیٹھے کہ کیا اونچائی پر مقناطیسی سوئیوں کا رویہ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا زمین پر۔ اس پرواز کے دوران ایک واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ایک لاعلم گڈریا لڑکی یہ سمجھ بیٹھی کہ ایک معجزے کا ظہور ہوا۔

غبارہ تقریباً 7000 فٹ کی اونچائی تک گیا لیکن دونوں سائنس داں اور اونچا جانا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے بہت سی چیزیں جو اپنے ساتھ لائے تھے، نیچے پھینکنی شروع کر دیں۔ ان چیزوں میں سے ایک بھونڈی سی سفید رنگ کی لکڑی کی کرسی بھی تھی۔ یہ زمین پر گری اور جھاڑیوں میں رک گئی۔ گرتے وقت گڈریاں سے ٹکراتے ہوئے بال بال بچی۔ کسی طرح متحیر ہو کر اس لڑکی نے آسمان سے گرتی ہوئی چیز دیکھی۔ اس واقعے کا بیان ایک مشہور فرانسیسی سائنسداں نے کیا ہے۔ وہ غباروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس لیے سوائے اس کے کہ فرشتوں نے آسمان سے اس کے لیے کرسی

بھیجی ہے، اس غیر معمولی واقعے کی کوئی دوسری وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے اس کو جھاڑیوں میں سے نکالا۔ لیکن اس کی طفلانہ کاریگری دیکھ کر اس کو تعجب ہوا۔ اس نے سوچا کہ یقیناً فرشتے اس سے بہتر فرنیچر بنا سکتے تھے۔ یہ معمہ اس وقت تک حل نہیں ہوا جب تک کہ ایک اخباری کتابچہ نے اس اڑان کی تفصیلات دیں اور ان اشیا کا ذکر کیا جو سائنسدانوں نے باہر پھینکی تھیں۔

چارلس کا غبارے کو ہائیڈروجن سے بھرنے کا خیال کوئی نیا نہیں تھا کیونکہ ایڈنبرگ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر جوزف بلیک نے کچھ سال پہلے ایسا کیا تھا۔

1776 میں بلیک کو کیونڈش کی ہائیڈروجن کی دریافت کا حال معلوم ہوا تھا اور اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ نئی گیس سے بھرا ہوا غبارہ ہوا سے ہلکا ہوگا، اس لیے جب اس کو آزاد چھوڑا جائے گا تو یہ اوپر اٹھے گا۔ اس نے سوچا کہ اپنی مرضی سے ایک گیس سے بھرے بھکنے کا اٹھنا بہت حیرت انگیز ہوگا۔ اس نے اپنے دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا اور کھانے کے بعد ہائیڈروجن سے بھرے بھکنے کو ہوا میں اڑا دیا۔ اس طرح اس کے دوست وہ پہلے لوگ تھے جنھوں نے ایک غبارے کو ہوا میں اڑتے دیکھا۔ انھیں تعجب ہوا کہ کس طرح بلیک نے غبارے کو چھت تک پہنچانے میں حرفت دکھلائی۔ اس کا ایک ممکن طریقہ اس شام کی تفریحات میں اس طرح پیش کیا گیا:

''ہائیڈروجن کی دریافت کے بعد جلد ہی یہ بتایا گیا کہ یہ گیس ہوا سے دس گنا ہلکی ہے۔ ڈاکٹر بلیک نے اپنے دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا اور اطلاع دی کہ وہ انھیں دکھانے کے لیے ایک استعجاب ہے۔''

ڈاکٹر ہٹن، مسٹر کلارک آف ایلڈن اور سر جارج کلارک آف پینیک ممبران تھے۔ جب مدعوئین جمع ہو گئے تو وہ ان کو ایک کمرے میں لے گیا۔ اس کے پاس گائے کے بچے کی کھال سے بنا ایک بھکنا تھا جس کو اس نے ہائیڈروجن سے بھر لیا اور اس کو آزاد چھوڑ دیا۔ وہ جلد ہی اوپر اٹھا اور چھت سے چپک گیا۔ اسے یہ مان لیا گیا کہ بھکنے سے ایک باریک کالا دھاگا بندھا ہوا تھا اور اس دھاگے کو چھت سے نکال دیا گیا تھا۔ اس دھاگے کو اوپر سے کوئی کھینچ رہا تھا جس کی وجہ سے غبارہ چھت تک اٹھ کر ایک خاص جگہ پر آ گیا تھا۔ یہ تشریح ایسی برجستہ اور لگتی ہوئی تھی کہ تمام لوگوں نے اس کو مان لیا۔ اگرچہ یہ اور دوسری تشریحات کی طرح معقول لگتی ہے لیکن یہ بالکل بے بنیاد لگتی ہے۔ جب بھکنے کو نیچے لایا گیا تو اس میں دھاگا وغیرہ کوئی چیز بندھی ہوئی نہیں تھی۔ ڈاکٹر بلیک نے اس کے اوپر جانے کی وجہ کی تشریح اپنے دوستوں سے کی۔ لیکن یہ ڈاکٹر بلیک کی اپنی شہرت سے بے رخی اور لوگوں کو اطلاع پہنچانے میں لاپروائی تھی کہ انھوں نے اس تجسس پیدا کرنے والے تجربے کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو بھی نہیں بتایا اور بارہ سال سے زیادہ عرصے کے بعد ہائیڈروجن گیس کی اس خاصیت کو پیرس میں ایم چارلس نے غباروں کو ہوا میں اڑانے میں استعمال کیا۔

□□□


## مجموعۂ نغز

**مصنف: قدرت اللہ قاسم**

حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا یہ مشہور تذکرہ، دو جلدوں میں تھا جسے فاضل مرتب پروفیسر محمود شیرانی نے یکجا کر دیا ہے۔ پروفیسر شیرانی کا خیال ہے کہ محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آب حیات کا ایک اہم ماخذ یہ تذکرہ بھی ہے جس کا قلمی نسخہ انھیں آزاد کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوا۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 492، قیمت: -/268 روپے

## عربی ادب کی تاریخ (تین جلدوں میں)

**مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی**

مدارس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اردو میں کوئی ایسی کتاب دستیاب نہیں تھی جس میں عربی ادب کی جامع اور مبسوط تاریخ بیان کی گئی ہو۔ ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ کتاب کی پہلی جلد میں زمانۂ جاہلیت، دوسری جلد میں حضرت محمدؐ کے عہد سے خلفائے راشدین کے عہد نیز اموی دور اور تیسری جلد میں عباسی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات: جلد اول: 352، جلد دوم: 390، جلد سوم: زیر طبع
قیمت: جلد اول: 86 روپے، جلد دوم: 91 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

مہیندر ناتھ

# پیشہ ور رشوت خور

بادشاہ اکبر کے دربار کا ایک ملازم تھا رام لال، وہ سرکاری گودام میں کام کرتا تھا۔ کسانوں کی لائی ہوئی لگان کے اناج کو وہ گودام میں رکھ کر اس کی رسید کسانوں کو دیا کرتا تھا۔ اپنے کام میں وہ بہت ہوشیار تھا اور سب لوگ اس کے کام سے خوش تھے مگر اس میں ایک بُری عادت تھی کہ وہ بغیر رشوت لیے کوئی رسید نہیں دیتا تھا۔ جب اس کی رشوت خوری سے لوگ پریشان ہوگئے تو اس کی شکایت بادشاہ کے پاس پہنچی۔ رام لال کی پیشی ہوئی۔

''کیا یہ سچ ہے کہ تم رشوت لیتے ہو؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

''ہاں، مائی باپ'' رام لال ہاتھ جوڑ کر نرمی سے بولا۔

بادشاہ کو اس کی صاف گوئی پسند آئی۔ چونکہ وہ قابل کلرک تھا اس لیے بادشاہ نے اسے سمجھایا کہ وہ یہ بُری عادت چھوڑ دے۔

''حضور'' رام لال سر جھکا کر بولا'' رشوت لینا میرا خاندانی پیشہ ہے، اور میرے خون میں ہے اس کے بغیر تو میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔''

اتفاق سے بادشاہ اس دن اچھے موڈ میں تھا، ناراض نہیں ہوا بلکہ مسکرایا'' تم رشوت لوگے ہی؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

''ہاں سرکار'' رام لال بولا'' لینا ہی پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے'' بادشاہ نے کہا'' تم کو ایسی جگہ تعینات کرتا ہوں جہاں رشوت کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی، دیکھتا ہوں وہاں کیسے رشوت لیتے ہو۔''

''حضور مائی باپ ہیں'' رام لال بولا'' جیسی آپ کی مرضی۔''

''آج سے تم جمنا کی لہریں گنا کروگے'' بادشاہ کا حکم ہوا'' روز دریا میں جتنی لہریں اٹھیں ان کا حساب تم شام کو دفتر میں دیا کروگے، علاوہ اس کے اور کچھ نہیں کروگے۔''

دوسرے دن سے رام لال نے اپنا نیا کام کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دنوں تک رام لال کی کوئی شکایت نہیں آئی تو بادشاہ نے سوچا کہ وہ شاید سدھر گیا ہے۔ دھیرے دھیرے بادشاہ رام لال کو بھول گیا۔

ادھر رام لال کو رشوت نہ مل پانے سے اس کی راتوں کی نیند حرام ہو رہی تھی، وہ بے چین تھا اور رشوت لینے کا راستہ تلاش کرنے میں مصروف تھا۔ آخر اسے ایک طریقہ سوجھ ہی گیا۔

ایک دن ایک بڑا جہاز جمنا میں آیا۔ اس تجارتی جہاز میں تمام کھانے پینے کی اشیا اور پھل وغیرہ بھرے تھے۔ وہ اپنا سامان آگرہ میں بیچنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ کنارے آنے کی کوشش کرنے لگا مگر اب تو رام لال کو راستہ سوجھ گیا تھا، اس نے فوراً جہاز کو بیچ دریا میں ہی رکنے کا اشارہ کیا اور کہا کہ جب تک لہریں پوری طرح گن نہ لی جائیں اس جہاز کو وہیں رکنا ہوگا۔ جب جہاز کے مالک نے اعتراض کیا تو اسے شاہی فرمان دکھایا گیا۔ اب تو وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہیں کھڑا رہا۔ رام لال لہریں گنتا رہا، جہاز کھڑا رہا، لہریں اٹھتی رہیں اور جہاز میں لدا سامان خراب ہونے لگا۔ جہاز کے مالک نے رام لال سے بہت منت کی کہ اسے جانے دیا جائے۔

''ٹھیک ہے'' رام لال نے کہا کہ لہروں کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے مجھے اور زیادہ دیر تک کام کرنا پڑے گا۔ اس کا ہرجانہ اگر تم دینے کو راضی ہو تو میں لہروں کی گنتی تھوڑی دیر کے لیے روک دیتا ہوں۔''

National Council for Promotion of Urdu Language * New Delhi *
ACC No. 5180
15/10/08

مرتا کیا نہ کرتا جہاز کے مالک نے رام لال کی جیب گرم کی اور اپنا جہاز لے کر کنارے آیا۔

رام لال کا رشوت کا سلسلہ پھر چل پڑا۔

کچھ دنوں کے بعد اس کی اطلاع بادشاہ کو ملی۔ اس کو غصہ تو آیا لیکن رام لال کی باتوں سے بچ نکلنے کے لیے اس نے کوئی سزا نہیں دی، بس اسے نوکری سے نکال دیا۔

قبل اس کے کہ رام لال کو کھانے کے لالے پڑتے، اس نے ایک کام تلاش کر ہی لیا۔ وہ دفتر کے کاموں میں ماہر تھا اس لیے اس نے شاہی کچہری کے سامنے بیٹھ کر عرضی نویسی کا کام شروع کر دیا۔ وہ اپنے فن میں استاد تھا۔ لوگ اس سے عرضیاں لکھوانے لگے۔ جو عرضی وہ لکھتا تھا اس میں کوئی غلطی نہیں ہوتی تھی اور ان کو پاس ہونے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی تھی۔ لوگ اس کو اپنے کاغذات دکھاتے کہ ان میں کوئی غلطی تو نہیں ہے۔ رام لال ان کاغذات کو دیکھ کر ان پر کنارے ایک چھوٹا سا دستخط کر دیتا تھا۔ جب دفتر والے وہ چھوٹا دستخط دیکھتے، اس کو پاس کر دیتے۔ کچھ دنوں کے بعد تو ایسا ہونے لگا کہ جن کاغذوں پر وہ چھوٹے دستخط نہیں ہوتے تھے، وہ پاس ہی نہیں ہوتے تھے۔ ان چھوٹے دستخطوں کی بڑی اہمیت ہوگئی اور وہ بغیر رشوت لیے کسی کاغذ پر دستخط نہیں کرتا تھا۔

رام لال کا رشوت کا کاروبار پھر چل نکلا۔ ایک بار بادشاہ نے کسی رقاصہ سے خوش ہو کر اسے چار گاؤں انعام میں دیے۔ اسے بادشاہ کے دستخط والا فرمان دیا گیا۔ وہ رقاصہ اس فرمان کو لے کر کچہری گئی تاکہ ان چار گاؤں کی تفصیل اسے مہیا کرائی جائے اور سرکاری رجسٹر پر اس کا نام درج کیا جائے۔ دفتر والوں نے اس فرمان کو دیکھا اور کہا کہ اس پر وہ چھوٹے والے دستخط نہیں، اس لیے اس فرمان پر کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ اس رقاصہ کو بتایا گیا کہ وہ چھوٹے والے دستخط کہاں کرانے ہیں۔

جب وہ رقاصہ رام لال کے پاس پہنچی تو رام لال نے دستخط کرنے کے بدلے میں ایک گاؤں کی رشوت مانگی۔ رقاصہ نے انکار کر دیا۔ رام لال نے دستخط نہیں کیے اور اس شاہی فرمان کی تعمیل نہیں ہوئی۔ بات بڑھ گئی اور آخر کار وہ رقاصہ پھر دربار میں پہنچی۔

جب پورا حال بیان کیا گیا تو بادشاہ کو غصہ آیا اور ساتھ ہی تعجب بھی ہوا کہ کون ایسا انسان ہے جو بادشاہ کے دستخطوں کے اوپر دستخط کرتا ہے۔

جب تفتیش کی گئی تو پتہ چلا کہ یہ رام لال ہے۔ اس کا رشوت کا کاروبار پھر سے شروع ہوگیا تھا اور اس بار تو وہ بادشاہ کا بھی حاکم بن بیٹھا تھا۔

رام لال کی پیشی ہوئی۔ بادشاہ غصہ تو تھا لیکن رام لال کی ذہانت کا لوہا مان گیا۔ اس نے سوچا کہ اتنے ذہین آدمی کو سزا نہیں دینی چاہیے بلکہ اس کی ذہانت کا استعمال کرنا چاہیے۔ بادشاہ نے رام لال کو سرکاری خزانے میں نوکری دی اور اس سے قسم کھلوائی کہ وہ اب رشوت نہیں لے گا۔ رام لال نے توبہ کی۔ یہ تو پتہ نہیں ہے کہ رام لال نے اپنی زبان کا پاس رکھا یا نہیں لیکن اس کے بعد رام لال کا نام کہیں نہیں آیا۔

**رابطہ:**
8/7, Alkapuri Apartment
Hastings Road, Allahabad
(U.P.)

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

# "فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

"فکر و تحقیق" کا تازہ شمارہ "داغ دہلوی نمبر" ہے جو ان کی وفات پر سو سال گزر جانے پر شائع کیا گیا ہے۔ اس خصوصی اشاعت میں جہاں ایسے مضامین شامل ہیں جو داغ کی شخصیت اور شاعری پر نئی روشنی ڈالتے ہیں، وہیں کچھ مضامین ان کے ان شاگردوں کا تعارف کراتے ہیں جنھیں اپنے استاد کی جانشینی کا شرف حاصل ہوا۔

"فکر و تحقیق" کا داغ دہلوی نمبر اردو کے اس باکمال شاعر کو خراجِ عقیدت بھی ہے اور داغ کے فکر و فن کی تفہیم و تحسین کی ایک سنجیدہ کوشش بھی۔

272 صفحات پر مشتمل اس یادگار نمبر کی قیمت عام شماروں جتنی ہی رکھی گئی ہے۔

"فکر و تحقیق" کی سالانہ قیمت صرف سو روپے ہے، فی شمارہ پچیس روپے۔

سالانہ قیمت بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں۔

**دہلی سے باہر کے حضرات چیک نہ بھیجیں۔**

## غیر ملکی خریداروں کے لیے

| | سادہ ڈاک رجسٹرڈ | سادہ ڈاک آرڈینری | ہوائی ڈاک رجسٹرڈ | ہوائی ڈاک آرڈینری |
|---|---|---|---|---|
| پاکستان | 184 روپے | 172 روپے | 316 روپے | 256 روپے |
| نیپال | 228 روپے | 160 روپے | 360 روپے | 292 روپے |
| بنگلہ دیش | 174 روپے | 146 روپے | 306 روپے | 238 روپے |
| دیگر ممالک | 220 روپے | 160 روپے | 396 روپے | 336 روپے |

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک: 8، وِنگ: 7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066

RNI No. 70323/99
DL-SW-15/4104/2006-08
Date of Publication : 24/11/2006

**URDU DUNIYA** **Monthly, December 2006, Vol. 8, Issue: 12**
***National Council for Promotion of Urdu Language***
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

اردو والوں کے لیے سنہرا موقع
کتابوں پر خصوصی رعایت

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

**National Council for Promotion of Urdu Language**
**Govt. of India, New Delhi**

آٹھواں کل ہند
# اردو کتاب میلہ
17 تا 24 دسمبر، 2006

आठवां कुल हिन्द उर्दू किताब मेला

8th Kul Hind Urdu Kitab Mela

ENTRY FREE

داخلہ مفت

**بہ اشتراک** : مغربی بنگال اردو اکادمی، کولکاتا

| | |
|---|---|
| مقام : محمد علی پارک، سینٹرل ایوینیو، نزد زکریا اسٹریٹ، کولکاتا-7 | وقت : صبح 11.00 بجے سے رات 8.00 بجے تک |

اردو زبان میں ہر موضوع پر کتابیں دستیاب ہیں ملک بھر کے تمام مشہور و معروف ناشرین
شرکت کر رہے ہیں کتاب میلے کے دوران روزانہ مختلف پروگرام جیسے سمینار، مذاکرہ،
مشاعرہ، شام غزل، بیت بازی وغیرہ بھی منعقد کیے جائیں گے

Printed and Published by Rashmi Chowdhary, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Rashmi Chowdhary, Tel : 26103381, 261039